زندگی کے ۷۰ سال

انور موٹن

Copyrights reserved

ترتیب

دیباچہ 4

باب ۱ 9

خواب 9

باب ۲ 15

بچپن 15

باب ۳ 32

دادا کا خاندان 32

باب ۴ 35

نانی کا خاندان 35

باب ۵ 37

۱۹۶۵-۱۹۷۲ 37

باب ٦ 60

۱۹۷۲-۱۹۸۵ 60

باب ۷ 100

۱۹۸۵-۱۹۹۸ 100

باب ۸ 118

۱۹۹۹ - تا دمِ تحریر 118

باب ۹ 147

ہمارے ابا جان کی سوانح حیات انہیں کی زبانی 147

باب ۱۰ 162

زندگی سے حاصل اسباق 162

دیباچہ

کسی قوم کی تاریخ کو تحریری شکل میں لانا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے، خاص طور پر جب اسے ہزاروں سالوں سے نظر انداز کیا گیا ہو۔ میں نے کئ سالوں کی تحقیق و جستجو کے بعد اپنی قوم کی کہانی کو قلمبند کرنے کا بیڑا اٹھایا اور سنہ دو ہزار چھ میں ہسٹری اف میمنز کے نام سے شائع کیا۔ میری ساٹھویں سالگرہ پر میری نواسی تیشا نور جو اس وقت سات سال کی تھی مجھ سے کہنے لگی کے "نانا آپ بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں"۔ امریکہ میں ساٹھ سال درمیانی عمر کہلاتی ہے اور یوں بھی اللہ کے فضل سے میں خاصہ صحتمند تھا۔ اس موقعہ پر مجھے احساس ہوا کہ مجھے اپنی زندگی کے تجربات بھی زیر تحریر لانا چاہییں، اپنی کامیابیاں اور ناکامیاں، اپنے اچھے اور برے تجربات بیان کرنا چاہییں تاکہ آنے والی نسلیں ان سے کچھ فائدہ اٹھا سکیں۔ اسی وقت میں نے ارادہ کر لیا کے میں باسٹھ سال کی عمر میں ریٹائرمنٹ لے لوں گا، اس طرح میرے پاس پاکستان میں کام کرنے کے تجربے کو چھوڑ کر تقریباً چوالیس سال کا پیشہ ورانہ تجربہ ہو جائیگا۔ اس فیصلے سے میں نے اپنے باس کو آگاہ کر دیا اور

یوں باسٹھ سال کی عمر میں ریٹائرمنٹ لے لی۔ اس ریٹائرمنٹ کی وجہ سے مجھے اپنے بیوی، بچوں اور ناتے نواسیوں کے ساتھ وقت گزارنے کے علاوہ اس کتاب کو مرتب کرنے میں کافی آسانی ہو گئی۔

اس سے پہلے مجھے خوش قسمتی سے سعودی عرب کی ایک کمپنی میں کسنلٹنسی کا کام مل گیا تھا، اس وقت میرے دو بچے تھے، دو سال کی بیٹی اور ایک سال کا بیٹا، کام سے چھٹیوں کے دوران میں نے اپنی اہلیہ یاسمین اور بچوں کے ساتھ نہ صرف دنیا کے کئی ممالک کی سیر کی بلکہ ہمیں مختلف تہذیب و تمدن قریب سے دیکھنے کا بھی کافی موقعہ ملا۔

ثقافت اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں، ہمارے معاشرے میں کئی دقیانوسی رسم و راج آج تک چلے آرہے ہیں جو مذہب کے بھی برخلاف ہیں۔ ایسا ہی ایک مسئلہ بہوؤں کے ساتھ بدسلوکی بھی ہے، جو بعض اوقات وحشیانہ حد تک بڑھ جاتی ہے۔ یہ مسئلہ خالی لڑکیوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ کئی لڑکے بھی اسکا شکار ہو جاتے ہیں، خاص طور پر جب کسی پسماندہ خاندان میں بہت زیادہ بچے ہوں تو۔ بچوں کے ساتھ زیادتی ایک وائرس کی شکل اختیار کر چکی ہے اور نامعلوم وجوہات کی بنا پر بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ بزرگوں کا احترام مذہبی فریضہ ہے، تاہم بہوؤں کے ساتھ ناروا سلوک ایک ایسا معاشرتی مسئلہ بن چکا ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ یہ تب ہی ختم ہو سکتا ہے جب والدین اور

مذہبی رہ نما اسے شعوری، عقلی اور مذہبی طور پر سمجھنے کی کوشش کریں اور جدید تحقیق سے بھی فائدہ اٹھائیں۔

اپنی زندگی کے تجربات لکھنا کوئی اسان کام نہیں، اللہ سے دعا ہے کہ وہ مجھے اس کام کو احسن طریقے سے کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور جو کچھ میں نے سیکھا اسے لوگوں تک پہنچانے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بنائے اور میری آئندہ آنے والی نسلیں اس سے سبق حاصل کر سکیں۔ میں اپنی اہلیہ کا بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری یادوں کے بند کھولنے میں بہت مدد کی اور کئی ایسی باتیں جو میں بھول چکا تھا مجھے یاد دلائیں۔

ایک زمانے میں میرے پاس ایک ڈائری ہوا کرتی تھی جو کئی سالوں میرے پاس رہی جس میں، میں اپنے روزانہ کے تجربات لکھتا تھا، لیکن جب نوکری کے سلسلے مجھے سعودی عرب جانا پڑا تو وہ ڈائری گھر پر ہی بھول گیا اور بد قسمتی سے وہ ردی اخباروں کے ساتھ فروخت ہو گئی۔ دوبارہ سے 40، 50 سال پرانی یادوں کو تازہ کرنا اور پھر انہیں قلم بند کرنا اچھا خاصا وقت لے لیتا ہے۔ ساتھ میں رشتے ناطے نبھانا، پارٹ ٹائم جاب کرنا اور میانمار میں اپنے فارماسیوٹیکل بزنس کو دیکھنا کوئی اسان کام نہیں۔ اس بات کے لیے میں اپنی اہلیہ کا اور بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے بہت صبر و تحمل کے ساتھ یہ وقت نہ صرف میرے ساتھ گزارا بلکہ بہت حد تک چیزوں کو درست کرنے میں میری مدد بھی کی۔

یہ کتاب دراصل میری انگریزی کتاب ٹریول ٹو دی فائنل ڈیسٹینی کا اردو ترجمہ ہے، انگریزی کتاب کی تدوین اور نظر ثانی کرنے میں ڈاکٹر رابرٹ بابسن نے میری کافی مدد کی تھی اس لیے میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے وقت نکال کر میری کتاب کو عزت بخشی، اور ڈاکٹر سید فیصل جیلانی کا بھی بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر نہایت محنت سے اس کتاب کی تدوین و تصحیح کی اور دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں صحت وتندرستی عطا فرمائے، آمین۔

میری آپ سے درخواست ہے کہ جب آپ یہ کتاب پڑھیں تو مجھے اور میرے اہل خانہ کو دعاؤں میں یاد رکھیں اور ساتھ ساتھ اس بات کا بھی احساس کریں کہ انسان کو اپنے خاندان اور عزیز رشتہ داروں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھنا چاہیے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی سب سے پہلے مجھے ہدایت دے اور حق بات کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی ہدایت اور نیک سلوک کرنے کی توفیق دے۔ آمین

میری تمام قارئین سے گزارش ہے کہ جب بھی کسی کو ترقی کرتا ہوا دیکھیں ماشاءاللہ ضرور کہا کریں تاکہ اللہ تعالی نظر بد اور حاسدوں کے حسد سے محفوظ رکھے، جیسا کہ اللہ تعالی نے سورہ فلق میں ارشاد فرمایا ومن شر حاسد اذا حسد اور حسد کرنے والے کے حسد سے جب وہ حسد کرے۔ اللہ تعالی ہم سب کو نظر بد سے محفوظ رکھے امین۔

اس کتاب کے لکھنے سے میرا مقصد نہ تو اپنی بڑائی یا خوبیاں بیان کرنا ہے نہ ہی کسی کو نیچا دکھانا ہے، بلکہ اپنی زندگی کے تجربات و واقعات لوگوں کے سامنے رکھنا ہے کہ شاید میری آنے والی نسلیں اس سے کچھ سبق حاصل کر سکیں۔

امید ہے کہ آپ میری اس آپ بیتی سے بھرپور لطف اٹھا سکیں گے۔ یہاں مجھے ٹونی گاسکنز کا ایک مقولہ یاد آرہا ہے جو کچھ یوں ہے کہ "میں ہر اس شخص کو معاف کرتا ہوں جس نے مجھے کسی بھی طرح کی تکلیف پہنچائی ہو، میں اس سے نفرت نہیں کروں گا لیکن دوبارہ کبھی اسکے فریب میں نہیں آؤں گا اور نہ ہی اتنی قربت رکھوں گا کہ وہ مجھے دوبارہ تکلیف دے سکے۔ میں اپنی معافی کو اپنی حماقت نہیں بننے دے سکتا۔" مجھے نعمان علی خان کی بھی ایک بات یاد ارہی ہے جو مجھے بہت اچھی لگی انہوں نے کہا کہ "جب کم عقل لوگوں کے پاس کسی بات کا جواب نہیں ہوتا تو وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں اور گالم گلوچ پر اتر اتے ہیں، جبکہ عقلمند لوگ بد زبانی کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔"

باب ۱

خواب

میں پاکستان کے شہر کراچی میں پیدا ہوا محمد اور مومن موٹن کے ۱۰ بچوں میں سب سے بڑا ہوں میرے والدین ۱۹۵۲ میں ہندوستان کے جیت پور نامی گاؤں سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ ہمارے اجداد ۱۳ نسل پہلے اسلام لائے تھے اس لحاظ سے ہم تیرھویں نسل کے مسلمان ہیں، ہم اسلام کے تمام بنیادی عقائد پر ایمان رکھتے ہیں توحید، نماز، روزہ، حج اور زکوۃ پر۔

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا ساحلی شہر ہے، اسکا ساحل کوئی ۳۵ میل پر پھیلا ہوا ہے جس پر انگریزوں نے کے زمانے میں کچھ اچھا کام ہوا تھا، میں نے اپنا بچپن ان ساحلوں پر بڑا اچھا گزارا، میرا مشغلہ زیادہ تر تیراکی اور کرکٹ کھیلنا تھا۔

ہمارا خاندان بہت غریب تھا، مجھے ١٦ سال کی عمر میں ہی نوکری کرنا پڑی اور ایک مشین شاپ میں لیتھ مشین چلانے پر لگ گیا بعد میں اسٹینو ٹائپسٹ کے طور پر کچھ عرصہ کام کیا۔ جب میں فرسٹ ایئر ڈی جے سائس کالج کراچی میں تھا تو میرا ایک کزن عبداللہ موٹن امریکہ سے ملنے آیا اور مجھے بتایا کہ

امریکہ ایک خوابوں کی تعبیر والا ملک ہے، اسکی باتیں سن کر میرے دل میں امریکہ جانے کی خواہش پیدا ہو گئی، جانا کچھ مشکل بھی نہ تھا، مجھے غیر ملکی طالب علم ہونے کی وجہ سے انگریزی کا امتحان پاس کرنا تھا اور امریکہ کے کسی کالج میں داخلہ لینا تھا۔

چند ہی ہفتوں میں مجھے امریکہ کے شہر شکاگو کے ایک کالج میں داخلہ مل گیا جس کے بعد میں نے کراچی میں موجود امریکی سفارت خانے سے فوراً ہی اسٹوڈنٹ ویزا حاصل کیا اور روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔ ۲۷ مئی ۱۹۷۲ کو میں نے شکاگو شہر میں پہلا قدم رکھا اور اپنے پہلے کالج کریر کا آغاز کیا۔ میرے ایک دوست امین فطانی نے میرا تعارف ایک شیف سے کروایا جس کے نتیجے میں مجھے جان ہنکوک سنٹر کی ۹۵ ویں منزل پر واقع ایک پوش ریسٹورنٹ میں نوکری مل گئی اور میں نے کام شروع کر دیا۔

کالج کے اخراجات بہت زیادہ تھے، اور میں شکاگو کے سرد موسم کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے دو روم میٹ اور میں نے اگست ۱۹۷۳ میں ہیوسٹن منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ یونیورسٹی آف ہیوسٹن کے اخراجات شکاگو کے اسکولوں سے بہت کم تھے۔ میرا داخلہ کالج آف نیچرل سائنسز اینڈ میتھمیٹکس میں ہوا۔ یہیں سے میں نے اپنا پہلا ڈیٹا پروسیسنگ کورس کیا۔ IBM 360 اور UNIVAC 1108 شیئرنگ ٹائم پر جو کے ایک شیئرنگ سسٹم تھا۔ یہاں ایک دوست کے ذریعے میرا تعارف ڈیٹا پوائنٹ کارپوریشن سے ہوا جہاں مجھے کمپنی کے بقایاجات کی وصولی کے پروگراموں کے ساتھ ساتھ کچھ مسائل کو درست کرنے میں مدد کے لیے عارضی بنیادوں پر رکھ لیا گیا۔

سنہ ۱۹۷۵ میں مجھے سیف وے اسٹورز میں نائٹ اسٹاکر کے طور پر نوکری مل گئی۔ میں (ایکسٹینڈڈ سٹور لیول اسکیننگ) فائلوں کو ڈاؤن لوڈ کرنے اور قیمت میں رد و بدل کرنے کا بھی ذمہ دار تھا۔

میں اپریل ۱۹۷۹، سات سال کے طویل عرصے کے بعد وطن واپس آیا، گھر والوں نے میرے لیے پہلے ہی رشتے دیکھنا شروع کر دیے تھے، آخر یاسمین نامی لڑکی سے میری منگنی ہو گئی اور میں واپس امریکہ آگیا۔ اکتوبر ۱۹۷۹ میں، جب میں شادی کے لیے پاکستان جانے کی تیاری کر رہا تھا تو مجھے ہمارے ڈویژن آفس کے ڈیٹا پروسیسنگ مینیجر ڈیوڈ ویرین کا فون آیا۔ اس نے فون پر میرا انٹرویو کیا اور مجھے آنے اور ملنے کو کہا۔ یہ میری پیشہ ورانہ زندگی کا اہم موڑ تھا، ایک اچھا کیریئر شروع کرنے کا بہترین موقعہ ۔ میں نے اگلے دن ڈیوڈ سے ملاقات کی، اور اس نے مجھے ایک جونیئر پروگرامر کے طور پر نوکری کی پیشکش کی جس میں آر پی جی اور اسمبلر زبانوں کے ساتھ کام کرنا تھا۔

یاسمین اور میری شادی اسی سال نومبر میں ہوئی اور ہم واپس ہیوسٹن آ گئے۔ ہماری پہلی بیٹی شرین ۲۶ دسمبر ۱۹۸۰ کو پیدا ہوئی، یہ اللہ کی ایک بیش بہا نعمت تھی۔ ۱۰ جون ۱۹۸۳ کو ہمارا بیٹا نعمان پیدا ہوا۔ ایک بار پھر میری زندگی نے ایک نیا موڑ لیا، مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ ترقی و کامیابی کے لیے مزید تعلیم اور نئے نئے مواقعوں کی ضرورت پڑے گی، میں نے ڈیوڈ کی مدد سے پوری محنت کے ساتھ ڈیٹا انٹری کلرک سے لے کر پروگرامر تک کی تمام معلومات اور ملازمت کی ضروریات کے بارے میں آگاہی حاصل کی۔ آخر کار اس نے مجھے سسٹمز پروگرامنگ کی تربیت دی، اور میں سینئر سسٹم پروگرامر کے طور پر کام کرنے لگا۔

اس دوران میرے چار ماموں جو چالیس اور پچاس کی دہائی میں تھے کینسر کے مرض میں جان گنوا چکے تھے ، ان کی قبل از وقت موت نے میرے اندر ہسپتالوں کے لیے کام کرنے کی خواہش کو جنم دیا۔ میں نے ہاسپیٹل کارپوریشنز آف امریکہ میں نوکری کی درخواست دی۔ چند ہی ہفتوں کے اندر، ریاض، سعودی عرب میں کنگ فیصل ہسپتال میں پروجیکٹ لیڈ پوزیشن کے لیے میرا انٹرویو ہوا۔ میرا خاندان بہت خوش تھا۔ اس پوزیشن کے لیے ایک شاندار، ٹیکس سے پاک تنخواہ، ہر سال چھ ہفتے کی چھٹیاں، مفت رہائش، اور ہر سال پورے خاندان کے لیے سفری ٹکٹ کی پیشکش کی گئی تھی، جو میں نے بخوشی قبول کر لی۔ جولائی ۱۹۸۵ میں، میں نے پہلی بار ہسپتال کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ کسی ہسپتال کے لیے کام کرنا ریٹیل انڈسٹری میں کام کرنے سے بہت مختلف تھا، اس لیے مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ اسپتال میں کمپیوٹرڈیٹا بیس میکرو اور کمانڈ لیول میں لکھیں ہوئی تھیں جو کے غیر مستعمل ہوتی جا رہی تھیں، اسمبلر کے کئی پروسیس تھے، میں نے انہیں نئی طرح سے ڈیزائِن کر کے مینو سے چلنے والا نیا رجسٹریشن سسٹم متعارف کروایا ۔ یہ تبدیلی کامیاب رہی، اور صارفین نے اسے بہت پسند کیا۔ یہ میری ٹیم کی اسائنمنٹس کا صرف آغاز تھا۔ اس کے بعد ہم نے کئی کلینیکل ایپلی کیشنز تیار کیں، کئِ دوبارہ لکھیں اور ایک نیا آؤٹ پیشنٹ فارمیسی ماڈیول ابتدا سے انتہا تک کامیابی سے مکمل کیا۔

۱۹۹۰ کی خلیجی جنگ نے کنگ فیصل ہسپتال میں آئی ٹی کا ڈھانچہ بدل دیا۔ ڈاکٹرز سمیت کئی شخصیات نے ہماری اعانت کی جن میں چند قابل احترام کولمبیا کے پال کلیٹن اور سمترا سینگپتا، ونڈربلٹ کے ڈاکٹر ڈین سیٹگ، اور واشنگٹن یونیورسٹی کے ڈاکٹر تھامس پین وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ایک کلینکل انفارمیشن آرکیٹیکٹ کے طور پر میرے لیے سیکھنے کا ایک بہترین تجربہ تھا۔

جب ہسپتال میں انٹرنیٹ متعارف کرایا گیا تو میں نے ڈاکٹرز اور اسٹاف کو اس کے استعمال کی تربیت دینا شروع کی اس کے ساتھ ہی میں ایڈوائزری کمیٹی برائے ایڈوانسڈ ٹیکنالوجی اینڈ پلاننگ کا حصہ بھی بن گیا۔ ۱۹۹۸ تک میرے بچے ہائی اسکول سے فارغ ہو چکے تھے۔ اس دوران ہم دنیا کے چالیس سے زیادہ مختلف ممالک کے دورے کر چکے تھے۔ تب ہی ہم نے اپنے گھر ہیوسٹن واپس آنے کا فیصلہ کیا۔

سال ۲۰۰۰ کے مسائل افق پر تھے، مجھے آر سی جی کی کنسلٹنگ فرم میں نوکری مل چکی تھی۔ سب پریشان تھے کہ ۱۹۹۹ سے ۲۰۰۰ پر جانے میں پتہ نہیں کمپیوٹرز کس طرح کام کریں گے، ہر کمپنی اپنی اپنی تیاریوں میں تھی، اسی دوران مجھے میموریل ہرمن ہسپتال میں سال ۲۰۰۰ کی تیاری چیک کرنے اور اسکی تصدیق کرنے کا موقع ملا۔ آر سی جی کنسلٹنگ فرم میں میں عارضی پوزیشن پر تھا، اس لیے مستقل نوکری کی تلاش میں، میں نے نومبر ۱۹۹۹ میں ہیرس کاؤنٹی ہسپتال ڈسٹرکٹ میں درخواست ڈال دی تھی۔ جب مجھے ہیرس ہیلتھ سسٹم (ہیرس کاؤنٹی ہسپتال ڈسٹرکٹ) سے کال موصول ہوئی تو میں درخواست کے بارے میں بھول چکا تھا۔ میرا انٹرویو ایپلیکیشن سپورٹ مینیجر کے لیے ہوا اور مئی ۲۰۰۰ میں مجھے اس عہدے پر بھرتی کر لیا گیا۔ میں نے کلینیکل سسٹم کے ساتھ شروعات کی اور کچھ ہی دنوں میں مجھے اینسیلری سسٹمز اور انٹرفیس کے لیے اضافی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ میں نے ۲۰۱۳ تک انسلری سسٹمز کے شعبے کا انتظام کیا جس میں امیجنگ (ریڈیالوجی، کارڈیالوجی، جی آئی، پلمونری)، لیبارٹری اور پیتھالوجی، اور ہسپتال کے انفارمیشن سسٹمز (HIS) ڈیپارٹمنٹ کے ایمبولیٹری اور ان پیشنٹ فارمیسی سسٹم دونوں شامل تھے۔ اسی دوران میں نے اپنی پہلی کتاب، ہسٹری آف میمنز (میمنوں کی تاریخ) مکمل کی، اپنے خاندان اور دوستوں کے لیے ایک ویب سائٹ بھی قائم کی۔

جون ۲۰۱۳ میں مجھے ڈائریکٹر لیول کے عہدے پر ترقی دے دی گئی جس کے تحت ایمبولیٹری اور ان پیشنٹ فارمیسی سسٹم دونوں شعبوں کی ذمہ داری آتی تھی۔

میں ۴۴ سال پیشہ ورانہ زندگی گزارنے کے بعد اب ریٹائیر ہو چکا ہوں اور زیادہ تر وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ اور نواسے نواسیوں کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتا ہوں، ساتھ ساتھ کچھ باغبانی اور تھوڑی بہت کنسلٹنگ بھی کر لیتا ہوں۔ اس دوران یکم مئی ۲۰۱۷ کو میری والدہ خالق حقیقی سے جا ملیں اور ٦ ماہ بعد ہی ۲۴ اکتوبر، ۲۰۱۷ کو میرا ۳۴ سالہ بیٹا نعمان ہارٹ اٹیک کے ہاتھوں اپنی زندگی ہار گیا۔ اللہ تعالی ان سب کی مغفرت کرے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے، آمین۔

اگرچہ سال ۲۰۱۷ میرے اور میرے خاندان کے لیے بہت سخت تھا، لیکن اس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا، میرے دل میں اپنی سوانح عمری لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تا کہ میں اپنی زندگی کے واقعات و تجربات اپنی آنے والی نسلوں کے سامنے رکھ سکوں، شاید کہ وہ ان سے کچھ سبق حاصل کر سکیں، یہ سوانع عمری اسی سوچ کا نتیجہ ہے

باب ۲

بچپن

میں ۵ جنوری ۱۹۵۴ کوپیدا ہوا، میرے تیرھویں پیڑھی کے دادا مانیک جی اورسات سو دیگر خاندان والوں کے قبول اسلام کے تقریباً پانچ سو سال بعد، میری پیدائش کراچی میں اردو بازار کے قریب واقع سوبھراج میٹرنیٹی ہسپتال میں ہوئ جو میری نانی کے گھر سے قریب تھا اسے اس وقت پارسی اور عیسائی راہبائیں چلایا کرتی تھیں، ہم دس بہن بھائ اسی ہسپتال میں پیدا ہوئے، یہ ایک چیریٹیبل ہسپتال تھا جہاں کسی مریض سے کوئی پیسہ نہیں لیا جاتا تھا۔ میرا نام پہلے میرے دادا عبدالکریم کے نام پر رکھا گیا، لیکن پیدائش کے پہلے چند مہینوں میں بہت بیمار رہا، میرے والدین کو بتایا گیا کہ میرے پیٹ میں کھانا نہیں ٹھیر سکتا، میری صحت تیزی سے خراب ہو رہی تھی، میری نانی نے اس امید پر کہ میں ٹھیک ہو جاؤں گا، میرا نام بدل کر انور رکھ دیا، جسکا مطلب ہے روشنی، شاید یہ اس نام کا اثر تھا کہ میں ٹھیک ہونے لگا، میری یہ تصویر آٹھ ماہ کی ہے جسے دیکھ کر میری صحت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ (تصویر میری انگریزی کتاب میں دیکھ سکتے ہیں)۔

ہم رنچھوڑ لائن میں ہوتھی ماریکٹ کے قریب انور علی بلڈنگ کی دوسری منزل پر رہتے تھے۔ یہ فلیٹ میرے والد نے ۲۵۰۰ روپے میں خریدا تھا، یہاں ہم ۱۹۵۳ سے ۱۹٦۷ تک رہے، خوش قسمتی سے

میں نے اس عمارت کی آخری تصویر ۱۹۸۸ میں پاکستان کے دورے پر اپنے کیمرے میں محفوظ کر لی تھی، اب یہ عمارت موجود نہیں۔ ۱۹٦۷ میں ہم اس سے ملحقہ عمارت میں چوتھی منزل پر منتقل ہو گئے۔

رنچھوڑ لائن کا علاقہ جو اب غزدرآباد کہلاتا ہے شہر کا چھوٹا سا گائوں تھا، یہاں کے باشندے زیادہ تر مارواڑی تھے، ان میں سے کئی کی اپنی بھینسیں اور گائیں تھیں۔ ان کی کمائی زیادہ تر ان گایوں اور بھینسوں کے دودھ سے ہوتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم جس گلی میں رہتے تھے اس پر ان گایوں اور بھینسوں کا قبضہ تھا۔ یہ گلی گندگی اور غلاظت سے بھری ہوتی تھی۔ جوتے گندے کیے بغیر اس گلی سے گزرنا محال تھا، اس لیے بجائے چلنے کے ہم زیادہ تر چھلانگے مارتے اور گندگی پھلانگتے ہوئے مینڈکوں کی طرح اس گلی سے گزرتے۔ یہ علاقہ جواری چلاتے تھے اس لیے ہمیں کبھی بھی محلے میں کھیلنے کی اجازت نہیں تھی، میرے والد دوپہر کو کام پر جاتے ہوئے ہمیں نانی کے گھر کے قریب چھوڑ دیتے، جہاں ہم مغرب تک کھیلتے اور عام طور پر خود گھر آجاتے۔

جیسا پہلے ذکر کیا ہمارا گھر انور علی بلڈنگ کی دوسری منزل پر تھا، شام کو بلڈنگ میں داخل ہوتے ہی ہر طرف سے آپ کو تازہ روٹی پکنے کی مہک آتیں، جیسے ہی ہم گھر آتے ہاتھ منہ دھو کر کھانے کے لیے تیار ہو جاتے، تھوری دیر میں ہی والد صاحب بھی آجاتے، ہمارے ساتھ ہمارے ایک چچا بھی رہتے تھے، سب کے جمع ہوتے ہی امی ہمیں گھی اور چینی کے ساتھ گرما گرم روٹیاں دے دیتیں۔

رات کے کھانے کے بعد ہم سب بھائی بہن ابا کے گرد جمع ہو جاتے اور وہ اپنی ٹارزن کی کہانیاں سنانا شروع کر دیتے، ان میں زیادہ تر کہانیوں کا کوئی مطلب یا مقصد نہیں ہوتا تھا لیکن ہمیں پھر بھی مزہ آتا۔ کئی بار ابا ۱۹۵۰ کی دھائی کے اپنے پسندیدہ مکیش اور لتا منگیشکر کے گانے بھی سناتے جیسے، "یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے" یا "اے دل مجھے بتا دے تو کس پہ آگیا ہے" وغیرہ وغیرہ۔ میرے چھوٹے بھائیِ بہن کہانی یا گانا ختم ہونے سے پہلے ہی سو جاتے، آخیر میں، میں اور مجھ سے چھوٹا بھائی اشرف اپنا کام وغیرہ ختم کر کے پچھلے کمرے میں فرش پر اپنا بستر بچھا کر سونے کے لیے لیٹ جاتے۔ ایک بار والد صاحب نے ہمیں دو محبت کرنے والوں کی ایک کہانی سنائی جو صحرائے سہارا سے گذرے تھے، مجھے یاد نہیں کہ یہ پریوں کی کہانی تھی یا لیلیٰ مجنوں کی یا کوئی اور لیکن یہ کہانی دل کو چھو لینے والی تھی، اس رات ہم دونوں بھائِ بہت روئے تھے۔

مجھے سنہ ۱۹۵۸ بھی یاد ہے جب میں اور میرا چھوٹا بھائی اشرف اپنے نانا کے ساتھ کھیلا کرتے تھے، کبھی انکی پیٹھ پر چھلانگ لگاتے، کبھی کشتی لڑتے، انہیں سونے نہیں دیتے لیکن نانا کبھی ناراض نہیں ہوتے, وہ ہم دونوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ اپریل ۱۹۵۸ دن مجھے یاد نہیں لیکن ہم اپنی نانی کے گھر پر تھے کہ اچانک کوئی خبر سن کر نانی پریشان ہو گئیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گھسیٹتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے بھاگیں ساتھ میں میری خالہ زرینہ بھی تھیں، نیچے پہنچ کر میں نے دیکھا کہ میری والدہ ایک بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے ہیں، وہ اسی وقت ہسپتال سے آئیں تھیں جہاں ہمارا ایک

اور بھائی پیدا ہوا تھا جسکا نام صمد رکھا گیا، یہ اس وقت بالکل پیلا ہو رہا تھا، بعد میں مجھے بتایا گیا کہ کچھ بچوں کو پیدائش کے وقت یرقان ہو جاتا ہے اور وہ تھورا بڑے ہو کر صحت یاب ہو جاتے ہیں۔

ہمارے محلے کی مسجد کا نام بانگی مسجد تھا، جیسے ہی فجر کی اذان ہوتی میرے والد ہم دونوں بھائیوں کو جگا دیتے، انکی خواہش تھی بلکہ خواب تھا کہ ہم دونوں بھائی ائیر فورس میں، پاک فضائیہ میں شامل ہوں اس لیے انہیں ہماری صحت کی بہت فکر ہوتی تھی، ہمیں ہر وقت کسرت اور ورزش پر لکچر دیتے، کہتے تھے کہ ایک دن تم لوگ ایکیڈمی میں شرکت کے لیے سرگودھا ضرور جاؤ گے۔

ہماری بلڈنگ کے نیچے ایک کنواں تھا جس کا پانی پینے کے قابل تو نہیں تھا لیکن کپڑے، برتن اور نہانے دھونے وغیرہ کے کام آجاتا۔ اس پانی کو ہینڈ پمپ کے ذریعے بلڈنگ کی چھت پر موجود پانی کے ٹینک میں پہنچانے کی ذمہ داری ایک پٹھان کی تھی (شمالی مغربی صوبہ سرحد سے تعلق رکھنے والا پختون) جو ہر روز آدھی رات کے قریب آتا اور ہینڈ پمپ چلاتا، یہ ایک نہایت محنت طلب کام تھا، کیونکہ پمپ کو مسلسل چلانا پڑتا تھا، یہ پٹھان سب سے پہلے اوپر کی منزل پر جاتا اور ہر یونٹ کے والو بند کرتا پھر آدھی رات سے صبح تک پمپ چلاتا رہتا۔ اس کام کے اسے ان دنوں سو روپے سے کچھ کم ملا کرتے تھے۔ ہم دونوں بھائیوں کا کام حکومت کی فراہم کردہ پائپ لائن سے پینے کا پانی حاصل کرنا تھا، اس پانی کے لیے صبح سویرے سے لائن لگنا شروع ہو جاتی، لوگ ایک ایک کر کے اپنی اپنی

بالٹیاں بھرتے، کبھی کبھار خواتین میں نوک جھوک بھی ہو جایا کرتی، لیکن کسی نہ کسی طرح صبح نو بجے تک سب پانی لے ہی لیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم ہنڈا نامی بالٹیوں میں پانی بھر کر لاتے اور پھر اسے مٹکوں میں انڈیل دیا کرتے یہ پانی پینے کے ساتھ ساتھ کھانا پکانے میں بھی استعمال ہوتا تھا۔

ہفتہ اور اتوار کو فجر کی نماز کے بعد ہم دونوں بھائی والد صاحب کے ساتھ برنس گارڈن کی طرف روانہ ہو جاتے، فلیٹ سے اترتے ہوئے گراؤنڈ فلور پر ایک پنجابی فیملی رہتی تھی، انکا باتھ روم سیڑھیوں کے بالکل ساتھ تھا، اس خاندان کے سرپرست ایک بھاری بھرکم، اچھی خاصی ڈیل ڈول کے مالک تھے، اتفاق سے جب ہم نیچے اتر رہے ہوتے تو اسی وقت یہ بھی اپنے باتھ روم میں فطرت کا تقاضہ پورا کر رہے ہوتے اور ہم سب انکی دھماکے دار آوازیں 'سونک بوم' سن کر ہنستے ہوئے بلڈنگ سے باہر بھاگ جاتے۔

ایک دفعہ جب ہم برنس گارڈن میں واقع سندھ مدرسے پہنچے تو والد صاحب نے کہا آج سے ہم اس گیٹ سے دوسرے گیٹ تک دوڑ لگایا کریں گے، سندھ مدرسے کا دوسرا گیٹ ایک فزیکل ہیلتھ انسٹیٹیوٹ کے سامنے کھلتا تھا جہاں ایک صحت مرکز ہوا کرتا تھا، ہمیں اس مرکز میں داخلہ دلا دیا گیا، اس دوڑ کے بعد ہم آدھے گھنٹے تک اس صحت مرکز میں سخت قسم کی ورزش کرتے اور تھک ہار کر گھر پہنچتے، گھر پہنچنے سے پہلے ہی امی ہمارے لیے ناشتہ تیار کر چکی ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ ہم دو بھائیوں کے

علاوہ دو اور چھوٹے بھائی بھی ہمارے ساتھ ہو لیے، جب ہم سب نے دوڑنا شروع کیا تو وہ پیچھے رہ گئے اور رونے لگے، انہیں روتا دیکھ کر ہم بھی رونے لگے دوسرے گیٹ پر پہنچ کر جب ہم رکے تو پیچھے پیچھے دونوں چھوٹے بھائی بھی روتے ہوئے پہنچ گئے، جب والد صاحب نے ہمیں روتے دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولے کے تم سب میرے شیر کے بچے ہو، چپ ہو جاؤ اور رونا بند کرو، ابا کی بات سن کر ہم نے رونا بند کر دیا۔

برنس گارڈن ہماری ویک اینڈ کی تفریحی جگہ تھی جہاں ہم چاروں بھائی، میں مطلب انور، مجھ سے گیارہ ماہ چھوٹا، اشرف، پھر ڈھائی سال چھوٹا منور اور ساڑھے چار سال چھوٹا صمد انگریزوں کے زمانے کے زنگ آلود جھولوں پر جھولتے اور مختلف کھیل کود سے لطف اندوز ہوتے۔ اس وقت باقی بہن بھائی پیدا نہیں ہوئے تھے جنکا ذکر بعد میں آئے گا۔ ایک دن ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے پارسی جوڑے نے ہمیں پہلوانوں کی طرح لڑتے دیکھا تو چیخنے لگا یہ کس کے بچے ہیں، قریب ہی میرے والد کھڑے تھے انہوں نے کہا میرے بچے ہیں، پارسی نے اپنے مخصوص لہجے میں میرے والد کو ڈانٹا کہ آپ انہیں روکتے کیوں نہیں، لڑنا جھگڑنا اچھی بات نہیں، میرے والد اسکی باتیں سن کر صرف مسکرا دیے اور بات ہنس کر ٹال دی۔

صبع سویرے کے کاموں میں سے ایک کام دودھ خرید کر لانا بھی میری ذمہ داری تھی، دودھ بھی اس دوکان سے خریدا جاتا تھا جس کے متعلق یہ یقین ہوتا کہ یہ اصلی دودھ دے گا پانی نہیں ملائے گا۔ ایسی ہی ایک دوکان ہمارے گھر سے ڈیڑھ میل کی دوری پر تھی۔ روزآنہ مجھے ایک ڈبہ دے کر دودھ لینے بھیجا جاتا اور میں بنیان اور بھورے رنگ کی نیکر میں ننگے پائوں بھاگتا ہوا دودھ کی دوکان تک جاتا، بعض اوقات راستے میں حاجت محسوس ہوتی تو گھر واپس آتا، امی پریشان ہو جاتیں کہ کیا ہوا، لیکن پھر سمجھ جاتیں۔ یہ ذمہ داری وقت کے ساتھ ساتھ دوسرے بھائیوں پر پڑتی گئی۔

ناشتے میں زیادہ تر گرم چائے اور روٹیاں ہوتی تھیں۔ جب والد صاحب کے پاس کچھ پیسے زیادہ آ جاتے تو وہ ناشتے کے لیے بکرے کا قیمہ یا بکرے کی کلیجی خرید لیتے۔ کئی دفعہ ہمیں انڈے لینے کے لیے بھی بھیجتے، ان انڈوں کا اچھی طرح سے معائنہ ہوتا، اگر چھوٹے سائز کے ہوتے تو بولتے واپس کرا کر بڑے سائز کے لے کر آؤ، کبھی کبھار تو ہم واپس کر آتے، انکا پھر سائز چیک کیا جاتا اگر صحیح نہیں لگتا تو پھر واپس کرنے کا کہتے، ہمیں اچھا نہیں لگتا تھا کہ بار بار انڈے واپس کر کے دوسرے لیے جائیں اوریوں بھی انڈے والے سے کچھ خوف بھِی محسوس ہوتا تھا، ہم واپس آکر کہہ دیتے کہ اس نے واپس لینے سے انکار کر دیا ہے اس پر والد صاحب ہمیں ساتھ لے کر اپنی لنگی، (دھوتی) چڑھا کر انڈے والے کے پاس پہنچ جاتے اور اس سے کہتے کے میں خود چھانٹ کر لوں گا، انڈے والا پوچھتا رہتا کے کیا انڈوں میں کوئی خرابی ہے، لیکن والد صاحب اسکی ایک نہ سنتے اور اپنی مرضی کے بڑے

بڑے سائز کے انڈے چن لیتے، اور اسے تاکید کرتے کہ جب بچے آئیں تو انہیں اچھے اور بڑے بڑے سائز کے انڈے دیا کرو۔

صبح سویرے ہمارا ایک کام اور تھا وہ یہ کہ والد صاحب کے ساتھ بازار جا کر انہیں تازہ سبزیاں اور گوشت وغیرہ خریدتے ہوئے دیکھنا، اس کے لیے ہم سب سے پہلے ہوتی مارکیٹ میں واقع مولانا قصائی کی دوکان جاتے، جہاں سے آدھا سیر گوشت جو تقریباً آدھا کلو یا دو پاؤنڈ سے تھوڑا کم ہوتا ہے، خریدا جاتا۔ اس زمانے میں ایک سیر گوشت بارہ آنے کا آتا تھا، ایک روپے میں سولہ آنے ہوتے تھے، بعد میں آنے ختم ہو کر ایک روپیہ میں سو پیسے ہو گئے تھے۔ گوشت کی مارکیٹ سے باہر نکلتے ہی بہت ساری سبزیوں کی دوکانیں اور ٹھیلے وغیرہ کھڑے ہوتے تھے، سبزی بھی ایک خاص سبزی فروش سے کی جاتی جسکا نام بھوریا تھا، یہاں سے ٹماٹر، لہسن، ادرک، ہری مرچ، دھنیا اور آلو وغیرہ خریدا جاتا، مجھے یاد ہے کہ بھوریا کبھی بھی دھینا اور ہری مرچوں کے پیسے نہیں لیتا تھا بلکہ مفت میں ہی تھیلے میں ڈال دیتا۔ ان تمام چیزوں کی قیمت عام طور پر آٹھ آنے یا پچاس پیسے بنتی تھی۔

یہ جنوری ۱۹۵۹ کی بات ہے، دن یاد نہیں، جب ہم دونوں بھائیوں کو پتہ چلا کہ ہماری ختنہ کا فیصلہ کر لیا گیا ہے، ہمیں ختنہ کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ سردویوں کے دن تھے آخر وہ ٹھنڈی صبح آپہنچی، بہت سے مہمان بھی آ گئے اور ایک عدد نائی بمعہ اپنے ساز و سامان کے ساتھ گھر پہنچ گیا، خوف کے

مارے ہماری حالت خراب تھی، آخرکار ہمیں اس دردناک رسم سے نہ صرف گزرنا پڑا بلکہ یہ بھی پتہ چل گیا کہ ختنہ کیا ہوتی ہے اور چڑیا کیسے اڑتی ہے۔ ہم دونوں درد سے بہت چیخے چلائے لیکن کسی نے پرواہ نہ کی، سب مسکرا مسکرا کر ہمیں بستر پر پڑا ہوا دیکھتے رہے اور مبارکبادیں دیتے رہے۔ زخم وغیرہ ٹھیک ہونے کے کچھ عرصہ بعد ہی ہم نے ہفتہ میں ایک بار ایک خاتون استانی سے قرآن کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔

ادھر نانا نے شکایت شروع کر دی تھی کہ انہیں صحیح نظر نہیں آتا، آنکھیں خراب ہو رہی ہیں۔ انہیں ایک ماہر چشم کے پاس لے کر گئے تو پتہ چلا کے انکی دونوں آنکھوں میں موتیا بند اتر آیا ہے جسکا آپریشن کرانا پڑے گا۔ علاج کے لیے نانا کو ایک امراض چشم کے آؤٹ پیشنٹ کلینک میں داخل کراونا پڑا جہاں ان کی دونوں انکھوں کا اپریشن ہوا شام کو میری والدہ مجھے ان سے ملانے لے گئیں۔ ہم نانی کے گھر سے چلتے ہوئے سیدھا رتن تلاؤ پہنچے جہاں ایک دوراہا سا بنتا تھا ایک سڑک سیدھی صدر کی طرف جاتی تھی اور دوسری تبت سینٹر کی طرف، اس زمانے میں یہاں تبت سینٹر نہیں تھا بلکہ ایک چھوٹا سا خیراتی ہسپتال ہوا کرتا تھا جسے ایک مقامی گرجا گھر چلاتا تھا۔ جب ہم انکھوں کے مرکز میں داخل ہوئے تو نانا ایک چارپائی پر بیٹھے تھے اور ان کی انکھوں پر کپڑے کی ایک موٹی سی پٹی ڈلی ہوئی تھی۔

اگست ۱۹۵۹ کی ایک صبح مجھے محسوس ہوا کہ میرے کانوں میں کوئی سرگوشی کر رہا ہے کہ "انور بیٹا اٹھی ون"۔ جس کا مطلب ہے "انور بیٹا اٹھ جاؤ"، یہ میری ماں کی اواز تھی جو مجھے جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ میرے اسکول کا پہلا دن تھا۔ مجھے یہ دن آج بھی اچھی طرح یاد ہے، کمرے میں اندھیرا تھا اور ہمارے سروں روشنی کا چھوٹا سا ایک بلب کمرے میں روشنی کا واحد ذریعہ تھا، جس میں ہم دونوں بھائی فرش پر گدا ڈال کر سوتے تھے۔ اسی سے ملحق ایک چھوٹی سی جگہ تھی جہاں کچن مطلب باورچی خانہ اور کپڑے دھونے کی جگہ تھی، اس کے سامنے ایک اور کمرہ تھا جہاں میرے والدین اور دو چھوٹے بھائی فرش پر سوتے تھے۔ میرے والد مجھے لے کر اسکول روانہ ہو گئے جو ہمارے گھر سے تقریبا دو سے تین میل دور تھا۔ اسکول کا نام سرسید احمد اسکول تھا میرے والد نے مجھے کنڈر گارٹن میں داخل کروانے کے لیے پانچ روپے فیس ادا کی تھی۔

میری پیدائش یعنی ۱۹۵۴ سے لے کر ۱۹٦۷ تک جس سال میری سب سے چھوٹی بہن محمودہ پیدا ہوئی میری والدہ ۱۰ بچوں کو جنم دے چکی تھیں۔ میرے والد کی آمدنی دس بچوں اور ایک عدد چچا، جو حیدرابادمیں ہمیشہ زیر علاج رہتے تھے اور ساری زندگی زیر علاج رہے ان کے لیے بمشکل پوری ہو پاتی۔

۱۹۵۹ وہ سال ہے جس سال ایک امریکی صدر پہلی مرتبہ پاکستان کے دورہ پر آنے والے تھے، میرے والد بہت پرجوش اور بہت خوش تھے۔ انہوں نے ہم دونوں بھائیوں کو صبح سویرے تیار کرایا اور بندر روڈ، جو اب محمد علی جناح روڈ کہلاتی ہے، اس پر پہنچ گئے، جہاں سے امریکی صدر اور صدر ایوب خان کو گزرنا تھا۔ دسمبر کا ایک سرد دن تھا، سڑک کے دونوں اطراف ہزاروں لوگ قطار میں کھڑے تھے، ہم بھی اس قطار میں شامل ہو گئے، تھوڑی دیر بعد ہمیں گاڑی دکھائی دی اور ہم نے دونوں صدور کو ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھا۔ جب ہم ذرا بڑے ہوئے تو پتہ چلا کہ اس امریکی صدر کا نام ڈیوڈ ڈی آیزنہاور تھا۔ میں نے اس کی فلم اپنی سائٹ پر اپلوڈ کی ہوئی ہے۔ یہ ایک بہت پرانی اور تاریخی فلم ہے، جس میں دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح لوگ جوش و خروش سے امریکی صدر کا استقبال کر رہے ہیں۔

۱۹۶۰ کے اوائل میں میرے بھائی اشرف کا بھی نرسری کلاس میں داخلہ کروا دیا گیا۔ ہم دونوں بھائی باقاعدگی سے اسکول جانے لگے۔ کبھی کبھار میرے ایک ماموں رؤف جو اسی اسکول میں پڑھتے تھے ہماری نیکر گیلی ہونے پر ہمیں نانی کے ہاں لے جاتے، نانی ہمیں ایک پیار بھرا تھپڑ مارتیں، لیکن نہ صرف نیکر صاف کرتیں بلکہ کھانا پینا بھی کھلاتیں۔

ایک دن ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے اعلان کیا کہ سب بچوں کو ہاکس بے پکنک پر لے کر جائیں گے۔ ہم بہت خوش ہوئے گھر پہ امی کو بتایا جنہوں نے ایک چھوٹے سے لنچ باکس میں تھوڑا سا قیمہ اور چند روٹیاں رکھ کر ہمیں ساتھ لے جانے کے لیے دے دیا، یہ ہمارا تنہا پکنک پر جانے کا پہلا موقع

تھا۔ سب بچوں کو ایک بس میں بھر دیا گیا اور بس ہاکس بے کی طرف روآنہ ہو گئی۔ ہاکس بے میں ہر طرف چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہٹس بنے ہوئے تھے، جہاں لوگ بیٹھ کر ساحلی علاقے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ گو کہ اساتذہ نے ہمیں پانی کے قریب جانے سے منع کیا تھا لیکن پھر بھی ہمیں بہت مزہ آیا اور ہم نے خوب انجوائے کیا۔

میرے ایک ہم جماعت کی کاپیوں سے بہت اچھی خوشبو آیا کرتی تھی، میں نے اس سے ایک کتاب ادھار لے لی اور گھر لے ایا، پتہ نہیں کس طرح والد صاحب کو پتہ چل گیا، والد صاحب بہت ناراض ہوئے، اس روز پہلی دفعہ مجھے ایک زناٹے دار تھپڑ پڑا جو مجھے آج تک یاد ہے۔ میں نے وعدہ کیا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا اور کتاب واپس کر دی۔

۱۹۶۰ کا موسم گرما نہایت گرم تھا، میرے والد دوپہر کے کھانے کے بعد دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے انہیں بستر کی چادروں کا پردہ ڈال دیتے تھے تاکہ گرمی کی شدت کچھ کم ہو جائے اور ہم تھوڑی دیر کے لیے سو سکیں۔ اسی سال ہماری میمن برادری نے اعلان کیا کہ جیت پور میمن اسکول مکمل ہو چکا ہے اور بچوں کے لیے کھول دیا گیا ہے، ہم دونوں بھائیوں کا تبادلہ جیت پور میمن انگلش پرائمری اسکول میں ایک ہی جماعت میں کرا دیا گیا۔ خوش قسمتی سے اشرف کو ایک طرح کا پروموشن مل گیا اور اسے کنڈر گارٹن کلاس میں نہیں جانا پڑا۔

میرے دونوں بڑے ماموؤں غفار ماموں اور مجید ماموں کی منگنی پاکستان آنے سے پہلے جیت پور میں ہی کر دی گئی تھی، لیکن کچھ عرصے بعد چھوٹے ماموں مجید کی منگنی کسی وجہ سے توڑنا پڑ گئی تو نانی کو

زلیخا (جلو مامی) کے نام سے ایک اور خاتون مل گئیں۔ ان دونوں کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں تھیں۔ ایک دن ہم نانی کے گھر پہنچے تو شام کے قریب میرے والد اور نانا دونوں کام سے واپس آئے، نانا کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھیلا تھا، وہ تھیلا انہوں نے اپنے بستر پر رکھ دیا، پھر دونوں ماموؤں کو اواز دے کر بلایا اور بولا کہ تھیلا کھولو، ماموؤں نے تھیلا کھولا تو اندر سے دو شادی کے نئے سلے ہوئے سوٹ نکلے، دونوں بھائیوں نے اپنی شادی کے سوٹ ٹرائی کیے، سوٹوں کے ساتھ جناح کیپ بھی تھی۔ میری نانی کہتی رہی کہ دونوں بھائی "وراجا" دولہے لگ رہے ہیں۔ سب بہت خوش اور شادی کی تقریب کے منتظر تھے۔

۱۹۶۰ کی دہائی کے اوائل میں پاکستانی تھیٹروں میں ہندوستانی فلمیں چلتی تھیں لیکن والد صاحب ہمیں صرف انگریزی فلمیں دیکھانے لے جایا کرتے، کچھ فلموں کے نام مجھے یاد ہیں جن میں ٹارزن فائٹس فار ہز لائف، کنگ اف دا فارسٹ اور ہاتاری جس میں جان وین نے اداکاری کی تھی شامل ہے اس کے علاوہ کئی اور بھی تھیں۔

دسمبر ۱۹۶۰ کے ایک دن رؤف ماموں روتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے وہ بمشکل بول پا رہے تھے، ان کی باتوں سے میری امی سمجھ گئی کہ نانا کی طبیعت خراب ہے اور ان کے سینے میں درد اٹھا ہے، وہ مجھے لے کر نانی گھر روانہ ہو گئیں، جبکہ باقی سارے میرے والد کے ساتھ گھر پر ہی رک گئے۔ ابھی ہم کمرے میں داخل ہوئے تھے کہ اچانک مجھے کسی نے دوسرے کمرے میں گھسیٹ لیا، میں بمشکل اپنے نانا کو دیکھ پا رہا تھا، ایک ڈاکٹر ان کی حالت کا معائنہ کر رہا تھا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے میرے نانا

ہماری نظروں کے سامنے چل بسے۔ آج جب میں اس واقعے پہ غور کرتا ہوں تو مجھے اس ڈاکٹر کی جہالت کا اندازہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ میرے نانا کو دل کا دورہ پڑا ہے اور انہیں صرف کچھ اقدامات کر کے بچایا جا سکتا ہے، لیکن وہ نااہل ڈاکٹر کہتا رہا کہ بس موت کا وقت قریب آگیا ہے دعا کریں، جبکہ پورے ۳۰ منٹ کی اذیت کے بعد میرے نانا کا انتقال ہو گیا۔ اس سے ایک سبق حاصل کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ کبھی بھی کسی ڈاکٹر کی رائے پر بھروسہ نہ کریں اور ایمرجنسی میں اپنی عقل کا استعمال ضرور کریں۔

نانا کے انتقال کی وجہ سے شادی کئی ماہ کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ اخر کار وہ دن آپہنچا اور ہم چاروں بھائی اپنی امی اور والد کے ساتھ تیار ہو کر نانی کے گھر روانہ ہو گئے۔ دولہوں کی گاڑی تیار تھی - میرے چھوٹے بھائی کو کہا گیا کہ وہ ایک دولھے کی گود میں بیٹھ جائے اور ہم دونوں والد کے ساتھ پیدل چلنے لگے- تقریب برنس روڈ کے قریب جناح مسجد میں تھی جو جلد ہی ختم ہو گئی۔ ہم سب واپس نانی کے گھر اگئے جہاں خاندان کے لیے کھانے کا انتظام تھا- شام میں خواتین کا انتظام الگ جناح مسجد کے سامنے آمنہ منزل پر کیا گیا تھا۔ یہاں خواتین کا گانا بجانا چل رہا تھا، تھوڑی دیر میں دونوں دلہنیں بھی آگئیں۔ آخر ناچ گانا ختم ہوا اور دولہنوں کو رخصت کرا کے نانی کے گھر لے آیا گیا، اور ہم سب تھک ہار کر اپنے گھر کو روانہ ہوئے۔

جیت پور میمن اسکول میں پڑھنے کا خوب مزہ آیا، نئے دوست اور نئے نئے اساتذہ سے تعارف ہوا، ۱۹۶۰ سے ۱۹۶۵ تک، پہلی کلاس سے پانچویں کلاس تک ہمارے دو اساتذۃ تھے، محمود شاہ اور سلام

سبحانی۔ پہلی جماعت کے ہوم ٹیچر کا نام یاد نہیں، لیکن ہم لڑکیوں کے ساتھ تھے، درجہ دوم میں ہماری ہوم روم ٹیچر کا نام مس خالدہ تھا، تیسری جماعت میں محمود شاہ کلاس ٹیچر بن گئے۔

ہمارے مستقبل سنوارنے میں سر محمود شاہ کا بڑا عمل دخل ہے، انہوں نے ہمیں اچھی انگریزی بولنے اور لکھنے کی ترغیب دی، جب بھی کوئی کلاس میں غیر انگریزی لفظ بولتا اسے ایک پیسہ جرمانہ ادا کرنا پڑتا، اس زمانے میں سو پیسے کا ایک روپیہ ہوتا تھا، اور ہمیں جیب خرچ کے طور پر دو پیسے ملتے تھے، اس سے ایک پیسے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک پیسہ اچھا خاصہ جرمانہ تھا۔

آج ہمارے پاس پھر دو آنے جمع ہو چکے تھے، اور کھلونا خریدنے کی شاید اشرف یا منور کی باری تھی، لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ اب یہ کھلونے والا کبھی نظر نہیں آئے گا۔ کھلونے والے سے گزر کر تھوڑا آگے ہی نائی کی دوکان پڑتی تھی جہاں ہم چاروں بھائیوں کے بال تھوڑے سستے میں کٹ جاتے تھے۔

اسکول کی کلاس میں ہم دونوں بھائی پچھلی نشستوں پر بیٹھا کرتے تھے، لیکن کچھ ہی عرصہ میں ہم نے محسوس کیا کے ہمیں بلیک بورڈ ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا، ہم گھر پر اس کی شکایت کرتے رہے لیکن اسکا کوئی فائدہ نہیں ہوا، تاہم سر محمود شاہ کو اسکا اندازہ ہو گیا، شاید اس لیے کہ وہ بھی عینک لگاتے تھے، انہوں نے ہمیں اگلی نشستوں پر بٹھانا شروع کر دیا، اس تبدیلی سے کافی فرق پڑا، اس کلاس میں، میں اول نمبر پر آیا۔ نتائج کے اعلان کے دن سر محمود شاہ نے پہلی بار مجھے ہار خریدنے کے لیے بھیجا،

یہ ہار ہمارے جنرل سیکرٹری عبداللہ کامدار صاحب کو پہنانا تھا۔ بعد میں ان کے دو بیٹے امین اور محمود میرے بہنوئی بھی بن گئے ۔ محمود شاہ کو پکنک کا بہت شوق تھا، ایک دفعہ ۱۹۶۳ میں پوری کلاس کو ملیر کے کھیتوں میں لے گئے، وہاں بہت مزہ آیا، وہاں کچھ تصاویر بھی لی گئیں جن میں سے تین میں نے خریدی تھیں، دو کہیں گم ہو گئیں ایک میرے پاس ابھی تک ہے۔

اس زمانے میں رمضان سردیوں میں آیا کرتے تھے، یہ شاید جنوری کا مہینہ تھا، ہم اپنے والدین سے روزہ رکھنے کی زد کرتے رہتے لیکن ہمیں صرف ہفتہ کے آخیر میں روزہ رکھنے کی اجازت دی جاتی، اسکول میں ہمیں بہت شرمندگی ہوتی کیونکہ اکثر بچے روزے سے ہوتے تھے۔ ہمارا ایک ہم جماعت امین گل تھا جس سے چھوٹی موٹی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں، لیکن کچھ ہی عرصہ میں ہماری دوستی ہو گئی، اسکا ہمارے گھر انا جانا بھی شروع ہو گیا، اس نے ہمیں اپنی ماں کو احترام کے ساتھ پکارنا سکھایا، جیسے تم کے بجائے آپ کہنا۔ امین پورے رمضان کے روزے رکھتا اور مجھے بہت افسوس ہوتا بلکہ غصہ بھی آتا کہ میں ایسا کیوں نہیں کر سکتا۔

چوتھی جماعت میں ہمارا تعارف ہمارے سائنس ٹیچر لارنس پنٹو سے ہوا جنہوں نے ہمیں گانا بھی سکھایا۔ ایک شو کے دوران مجھے کنگ کا کردار ادا کرنے کے لیے نامزد کیا گیا جبکہ میرے ایک ساتھی یوسف ذکریا کو بھکاری کا۔ ہم دونوں نے وہ گانا بھی پیش کیا جو مجھے آج بھی یاد ہے، "اوہ گیو می اے ہوم"۔ اس شو میں حصہ لینے پر ہم دونوں کو ایک ایک عدد کیمل برانڈ قلم تحفے کے طور پر دیا گیا، مجھے

ایسا ہی ایک قلم تیسری جماعت میں اول آنے پر ملا تھا۔ یہ قلم میں نے کئی سال تک اپنے پاس رکھا، دوسرا اپنے یونس ماموں کو دے دیا جو یہ تحفہ پا کر بہت خوش ہوئے۔

سنہ ۱۹۶۴ کے رمضانوں میں ہمیں پورے روزے رکھنے کی اجازت مل گئی، اگرچہ کھائے بغیر گزارا کرنا آسان نہ تھا لیکن پھر بھی ہم نے نہ صرف پورے روزے رکھے بلکہ کمیونیٹی کی ایک مقامی مسجد، بانگی مسجد میں تراویح کی نمازوں میں بھی شرکت کی۔

جیت پور میمن اسکول صرف پانچویں جماعت تک تھا، مسئلہ یہ تھا کہ اس کے بعد کس اسکول میں داخلہ لیا جائے، اس پر کافی بحث ہوتی رہی۔ بہرالحال خوش قسمتی سے ہم میں سے زیادہ تر بچوں نے اگست ۱۹۶۵ میں ایمپرس مارکیٹ صدر کے قریب بمبئی میمن برادر ہوڈ اسکول میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی سال پاکستان اور بھارت کی مسئلہ کشمیر پر جنگ بھی چھڑ گئی، مسئلہ کشمیر جو ستّر سال سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد بھی ابھی تک حل نہیں ہوا، جنگ کے وہ سترہ دن بہت خوفناک تھے، میں انہیں یاد نہیں کرنا چاہتا۔

باب ۳

دادا کا خاندان

یہ ۱۴۵۴ کا سال تھا جب تیرہ پشت پہلے ہمارے دادا نے تقریباً ۷۰۰ دیگر خاندانوں کے ساتھ قبول اسلام کیا۔ ان خاندانوں نے اس وقت نقل مکانی شروع کی جب پیشن گوئی کے مطابق، انہیں مقامی ہندوؤں نے وہاں سے جانے کے لیے کہا۔ کئی سال بعد، میری ساتویں پشت کے دادا ناتھا جمعہ موٹن اپنے خاندان کے ساتھ ہندوستان کے شہر جیت پور آ گئے۔ وہ کمیونٹی کے معاملات میں کافی سرگرم تھے اور غالباً اس وقت جیت پور میمن ایسوسی ایشن میں کسی عہدے پر فائز تھے۔ یحییٰ ہاشم باوانی نے اپنی کتاب مائی جیت پور میں ان کا نام جیت پور کے ایک اہم عہدہ دار کے طور پر ذکر کیا ہے۔

ہمارے خاندان کی کنیت موٹن غالباً ناتھا جمعہ کے بیٹے غنی موٹن کے زمانے سے شروع ہوئی ہے۔ ہر موٹن جس سے آپ کی ملاقات ہو اس کا پردادا ایک ہی ہو گا: غنی ناتھا موٹن- قبول اسلام کے بعد بھی کئی سالوں تک میمن خاندان اپنے بچوں کو ہندو اور مسلم دونوں نام دیا کرتے تھے۔

میرے والد نے اپنے آباؤ اجداد کی جو کہانیاں ہم بھائی بہنوں کو سنائی ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ میرے والد کے دادا قاسم ایوب غنی موٹن مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ جسمانی طور پر بہت مضبوط انسان تھے۔ ریٹائرمنٹ میں بھی وہ کنویں سے پانی کی بالٹیاں نکال کر مسجد کے تالاب میں بھرا کرتے تھے ۔ اس تالاب سے لوگ نماز کے وقت وضو کیا کرتے تھے۔ ان کی تین بار شادی ہوئی، جب ۸۰ کی عمر میں انکا انتقال ہوا تو ان کی وراثت انکی آخری بیوی کے حصہ میں آئی۔ میرے دادا عبدالکریم اور ان کے بھائیوں نور محمد اور شکور کے حصہ میں کچھ نہ آیا اور ان سب کو اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرنا پڑی۔

میرے والد نے ہمیں بتایا کہ وہ اپنے دادا قاسم کے ساتھ اس وقت کھیلتے تھے جب ان کی عمر تقریباً ۴ یا ۵ سال تھی۔ میرے والد صاحب کو یاد ہے کہ ان کے دادا جب نماز کے لیے وضو کرتے تو ان کے چہرے پر پانی چھڑکتے اور ان سے کہتے:"موٹنڑیا مستان،" "تیرے لمبے لمبے کان،" "تیری ماں پکائی دھان تیرا باپ مسلمان۔"

میرے دادا عبدالکریم نے بھی اپنی زندگی میں تین بار شادی کی۔ ان کی پہلی بیوی سے ایک لڑکا جس کا نام موسیٰ اور ایک لڑکی تھی جس کا نام حنیفہ تھا۔ ولادت کے دوران بیوی کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے دوسری شادی کر لی، کچھ عرصہ بعد اسے طلاق دے دی، دوسری بیوی سے انکے کوئی اولاد نہیں ہوئی، طلاق کیوں دی یہ پتہ نہیں چل سکا، شاید اولاد نہ ہونے کے سبب۔ اسکے بعد انہوں نے تیسری

شادی کر لی، تیسری بیوی سے کئی بچے ہوئے، چار لڑکے اور دو لڑکیاں - غلام، رابعہ، عثمان، محمد (میرے والد)، حلیمہ اور عمر۔ غلام اپنی ابتدائی زندگی میں بہت بیمار ہو گیا اور سننے کی صلاحیت کھو بیٹھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس معذوری کے نتیجے میں وہ کبھی بولنا نہیں سیکھ سکا۔ رابعہ کی شادی نوعمری میں ہی ستار سلیمان موٹن سے ہو گئی۔ ان کے چھ لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ عثمان کے نو بچے تھے۔ محمد (میرے والد) کے دس بچے تھے، پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں، ترتیب میں انور، اشرف، منور، صمد، گل بانو (جس نے اپنا نام عائشہ رکھ لیا)، یاسمین، نسرین، حسینہ، ابراہیم اور محمودہ۔ حلیمہ ۱۷ سال کی عمر میں ٹی بی کی بیماری میں مبتلا ہوئیں اور اسی بیماری سے انتقال کر گئیں۔ چوتھے لڑکے عمر کا چھوٹی عمر میں ہی انتقال ہو گیا۔

باب ۴

نانی کا خاندان

میرے نانا تار محمد حاجی احمد اسحاق میانور اور میرے دادا ایک دوسرے کے کزن تھے، ایک ماموں کے بیٹے تھے دوسرے پھوپھی کے۔ نانا کی پیدائش سنہ ۱۹۰۰ میں ہوئی اور ساٹھ سال کی عمر میں ۱۹٦۰ میں انتقال کر گئے۔

ان کے سات بھائی اور دو بہنیں تھیں، بھائیوں میں ہاشم، تار محمد، شکور، ولی، سلیمان، ابراہیم، اور ایک اور تھے جنکا نام مجھے یاد نہیں، بہنوں میں امی فوئی اور ایک اور تھیں انکا بھی نام مجھے یاد نہیں۔ نانا کی شادی پندرہ سال کی عمر میں سنہ ۱۹۱۵ میں عائشہ احمد خان میانور [اندھا] سے ہوئی جنکی عمر اس وقت ۱۳ سال تھی۔ میری نانی کی پیدائش ۱۹۰۲ میں اور انتقال ۱۹۷۴ میں ہوا، ان کے چار بھائی تھے لطیف، شکور، ابرہیم اور سلیمان، دو بہنوں کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ نانا نانی کی شادی کے چودہ سال بعد سنہ ۱۹۳۰ میں میری امی کی پیدائش ہوئی، انہیں "کھوٹ جی" کہا جاتا تھا جس کا مطلب ہے "خاص"۔ دوسرا بیٹا غفار ۱۹۳۲ میں پیدا ہوا، تیسرا بیٹا مجید ۱۹۳۴ میں، چوتھا یونس ۱۹۳٦

میں، پانچواں عارف ۱۹۴۰ میں، چھٹی بیٹی زرینہ ۱۹۴۲ میں اور آخری بیٹا رؤف ۱۹۴۸ میں پیدا ہوا۔ میری والدہ کی شادی میرے والد محمد عبدالکریم موٹن سے مارچ ۱۹۵۳ میں ہوئی۔

۱۹۴۷ میں نانا نے جیت پور میں اپنے نئے گھر کی تعمیر مکمل کی ہی تھی کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ میں تقسیم ہند ہو گئی اور مسلم اکثریت کے لیے ایک نیا ملک پاکستان وجود میں آگیا۔ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کرنا کافی مشکل تھا۔ جب ۱۹۵۱ میں حالات زیادہ خراب ہونے لگے تو نانا نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا اور تیاری شروع کر دی۔ مقامی وکیلوں نے مشورہ دیا کہ نئے مکان کی تصاویر وغیرہ لے لی جائیں تا کہ پاکستان پہنچ کر اس پر کلیم لیا جا سکے، پاکستان پہنچ کر جو رقم ملی وہ دو بیڈ روم کا فلیٹ خریدنے کے لیے بھی ناکافی تھی۔ جیت پور کے مکان کی چند تصاویر میرے پاس ہیں، ان میں سے ایک تصویر پر نانا کا نام بھی لکھا ہوا ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ دھندلا گیا تھا لیکن میں نے فوٹو شاپ کی مدد سے کافی حد تک اسے اجاگر کر لیا ہے، گجراتی میں لکھا ہے "تار محمد حاجی احمد میانور ۱۹۴۷"

باب ۵

۱۹۶۵-۱۹۷۲

۱۹۶۵ کا موسم گرما ہمیشہ کی طرح گرم تھا، کچھ دوستوں نے بی ایم بی اسکول جانے کا فیصلہ کیا، جبکہ کچھ علاقے کے کسی دوسرے اسکول میں جانے کا سوچنے لگے۔ پانچویں جماعت کے دو کلاس فیلوز، عبدالستار اور توفیق احمد نے ایک اردو میڈیم اسکول میں داخلے کی درخواست بھر دی، انہیں چھٹی کے بجائے ساتویں کلاس میں داخلہ مل گیا، میں نے سوچا کیوں نہ میں بھی چھٹی کے بجائے ساتویں کلاس میں داخلہ لے لوں اس طرح ایک سال بچ جائے گا اور میں بھی ایک کلاس آگے ہو جاؤں گا، میں نے بھی ایسے ہی کسی اسکول کی تلاش شروع کر دی، تلاش کرتے کرتے مجھے ایک اردو میڈیم اسکول کا پتہ چلا جو تبت سینٹر کے سامنے واقع تھا، اگر آپ ایم اے جناح روڈ سے مشرق کی طرف چلیں تو کوئی ایک میل کے فاصلے پر سعید منزل کے دائیں طرف یہ اسکول پڑتا تھا۔ اسکول دیکھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی، اسکول کیا تھا ایک چھونپڑا سا تھا، لگتا تھا جیسے ابھی ٹوٹ کر گر جائے گا، گرمیوں کی وجہ سے شاید بچے بھی کم تھے اور کلاسس بھی زیادہ نہیں چل رہی تھیں۔ آخر کار میں اس نتیجے پر پہنچا کے بی ایم بی اسکول ہی ٹھیک ہے، میرے علم میں نہیں تھا کہ یہ میری زندگی کا بہترین فیصلہ ثابت ہو گا۔

بی ایم بی اسکول میں ہماری کلاسیس اگست ۱۹۶۵ میں شروع ہوئیں۔ اسکول دو شفٹوں میں چلتا تھا، صبح کی شفٹ لڑکیوں کے لیے جو دوپہر 12:30 ختم ہوتی تھی اور لڑکوں کی دوپہر 12:45 پر شروع ہو کر 4:00 بجے ختم ہوتی تھی۔ اسکول کے جنرل سیکریٹری عبدالرحمٰن چھاپڑا صاحب تھے، لڑکوں کے سیکشن کے ہیڈ ماسٹر سر افسر حسین اور لڑکیوں کے سیکشن کی پرنسپل مس ریاض مجید تھیں۔ ہمارے کلاس ٹیچر یا ہوم روم کے استاد شروع میں سر قمر الدین قادری تھے، جو تاریخ پڑھاتے تھے جبکہ سماجی علوم کے استاد سر امجد علی تھے جو اس وقت نئے نئے ہندوستان سے آئے تھے۔

لڑکوں کو 12:45 سے پہلے اسکول میں داخلے کی اجازت نہیں تھی، صبع کی شفٹ کی 12:30 بجے چھٹی ہونے کے بعد جب تمام لڑکیاں دوسرے گیٹ سے باہر نکل جاتیں تب لڑکے لائن سے اسکول میں داخل ہوتے۔ پھر کلاسوں میں کتابیں اور بیگ چھوڑنے کے بعد اسمبلی کے لیے اسکول کے گرائونڈ میں جمع ہو جاتے، سب اپنی کلاس کے لحاظ سے لائنوں میں کھڑے ہوتے تھے۔ پھر کوئی ایک طالب علم قرآن پاک کی تلاوت کرتا اور اسلامیات کے استاد اسکا ترجمہ کرتے اور موضوع کے لحاظ سے کوئی حدیث سناتے۔ اسمبلی ختم ہوتے ہی ہم مس مجید کے دفتر کے سامنے ایک لمبی سی گلی میں آجاتے جہاں ظہر کی نماز ادا کی جاتی۔ نماز بڑی جماعت کا کوئی طالب علم پڑھاتا، زیادہ تر اذان ہم سے دو جماعت آگے جمیل احمد میمن دیا کرتے تھے۔ نماز کے فوراً بعد کلاسیس شروع ہو جاتیں، ہر کلاس یا پیریڈ کا دورانیہ ۳۰ منٹ ہوتا تھا، اسکول کے اندر ایک سائڈ پر ایک گھنٹا لگا ہوا تھا جس کے ساتھ ایک لکڑی کا ہتھوڑا رکھا رہتا تھا، ہر ۳۰ منٹ کے بعد یہ گھنٹہ ایک دفعہ بجایا جاتا تا کہ کلاس ختم ہونے اور دوسری کلاس شروع ہونے کا وقت پتہ چل سکے۔ ریسس اور چھٹی کے وقت اس گھنٹے کو

ایک خاص انداز سے کئی دفعہ تیز تیز بجایا جاتا۔ چھٹی کے بعد ہم گھر نہیں جاتے بلکہ مغرب تک اسکول میں ہی کھیلتے رہتے بعض دفعہ تو عشا تک کھیل چلتا۔ کھیلوں میں زیادہ تر باسکٹ بال، فیلڈ ہاکی، والی بال اور بیڈمنٹن وغیرہ شامل تھے۔

نئے اسکول میں کئی نئے دوست بنے جن سے آج تک میل ملاپ جاری ہے، جن سے مل نہیں سکتے ان سے سوشل میڈیا کے ذریعے رابطہ رہتا ہے۔ بی ایم بی اسکول کا معیار جے، ایم، اے سے بہت بہتر تھا، ماہانہ ٹیسٹس کے نتائج سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کے مقابلہ سخت ہے، سالانہ امتحان میں میرا رینک پانچویں نمبر پر آیا۔ بد قسمتی سے کئی دوست ناکامی کی وجہ سے اسی سال اسکول چھوڑ کر چلے گئے۔ اسکول میں ہم نے اسکاؤٹ ٹیم بھی جائن کر لی تھی، اسکول کی طرف سے اسکاؤٹنگ کے لیے کوئٹہ جانے کا پروگرام بن رہا تھا، ہم نے والد صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے اجازت دے دی۔ کوئٹہ افغانستان کی سرحد کے قریب پاکستان کے صوبہ بلوچستان کا ایک شہر ہے۔ سفر کا خرچہ ۸۵ روپیہ فی اسٹوڈنٹ تھا، ان دنوں یہ رقم کافی زیادہ تھی، میرا خیال ہے کہ شاید والد صاحب نے اس خرچے کی ادائیگی کے لیے کسی سے ادھار لیا ہو گا۔ دو ہفتے کا پروگرام تھا، دس بارہ بچے سفر پر جانے کے لیے تیار ہو گئے، اسکول کی طرف سے ہمارے عربی کے استاد غفور صاحب اور قرآن کے ٹیچر استاد قاری ضیاء الدین صاحب کو اس ٹیم کے سربراہ کے طور پر مقرر کیا گیا۔ والد صاحب نے ہم دونوں بھائیوں کو ایک ایک کیری بیڈ دلا دیا، کیری بیٹ ایک طرح کا سفری بستر جس میں کپڑے بھی آجاتے ہیں۔ سفر پر روانہ ہونے والے دن ہم تیار ہو کر اسکول پہنچ گئے، آہستہ آہستہ

دوسرے اسٹوڈنٹس بھی آ گئے اور ہم سب اسکول بس میں سوار ہو کر ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔

ٹرین دوپہر کو کوئٹہ کے لیے روانہ ہوئی، ہمارے دونوں اساتذہ نے ہمارے کھانے پینے کا خاص خیال رکھا، دونوں نے بڑی محنت اور محبت سے رات کا کھانا اور صبح کا ناشتہ بنایا۔ یہ ٹرین کا ہمارا پہلا سفر تھا، اس ٹرین نے چوبیس گھنٹوں میں کوئٹہ پہنچنا تھا اور ہمیں دیکھنا تھا کے یہ چوبیس گھنٹے ٹرین میں بیٹھ کر کیسے گزارنے ہیں۔ آخر کار جب ہم کوئٹہ اسٹیشن پہنچے تو غفور سر کے والد کے کچھ ملازم ہمیں لینے کے لیے وہاں موجود تھے۔ غفور سر کے والدین کوئٹہ میں ہی رہتے تھے اور ہم سب کو انہیں کے گھر ٹھیرنا تھا۔ گھر پہنچنے پر کھانا تیار تھا، ہاتھ منہ دھو کر ہم سب کھانے کے لے بیٹھے اور خوب لطف اٹھایا۔ ہمارے رہنے کا انتظام گھر سے باہر بنے ہوئے کوارٹرز میں کیا گیا تھا، کھانے کے بعد ہم کوارٹرز میں آ گئے، سب نے اپنا اپنا بستر نکالا، کپڑے بدلے اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ فجر کی نماز کے بعد ورزش کرنا ہمارا معمول تھا۔ عام طور پر صبح آٹھ بجے کے بعد ہم مختلف مقامات کی سیر کو نکل جاتے۔ اس زمانہ میں کوئٹہ ایک چھوٹا سا شہر تھا، دیکھنے کی کوئی خاص جگہیں نہیں تھیں، زیادہ مزہ سواریوں اور کھانا کھانے میں آتا تھا۔ دو دن بعد ہم چمن اور شیخ واصل کے لیے روانہ ہوئے، یہ دونوں جگہیں افغانستان کی سرحد کے بالکل قریب ہیں۔ شیخ واصل میں ہم رات ریلوے اسٹیشن پر ہی سوئے، صبح بہت خوشگوار تھی، ناشتے کا بھی خوب لطف آیا، غفور سر کے بڑے بھائی نے ایک پہاڑی بکرا پکڑ لیا اور ذبح کر کے دوپہر اور رات کے کھانے کا بندوبست کیا۔ ہمارا آخری سفر زیارت

تھا جہاں ہم نے وہ گھر بھی دیکھا جہاں بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے اپنے زندگی کے آخری ایّام گزارتے تھے۔

جب ہم واپس گھر پہنچے تو ہمارے والدین بہت خوش ہوئے، یوں تو ہم صرف دو ہفتے باہر رہے تھے لیکن ہمیں لگتا تھا جیسے ہم کئی سالوں کے بعد گھر آئے ہیں، والدین کو لگا جیسے ہمارا وزن کچھ کم ہو گیا ہے، شاید یہ ٹھیک بھی تھا، سفر کے دوران ہمارا چلنا پھرنا بہت زیادہ تھا۔ باہر کے کھانے کھا کھا کر بھی ہم تھک گئے تھے اور ماں کے ہاتھ کا کھانا کھانے کے لیے بے چین تھے۔ ماں کے ہاتھ کے کھانے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے، دو ہفتے بعد ماں کے ہاتھ کا کھانا کچھ زیادہ ہی اچھا لگ رہا تھا۔

ہم ساتویں جماعت میں آ چکے تھے، اسکول کا ماحول بھی اچھا تھا اور ہمیں مزہ بھی خوب آ رہا تھا۔ والد صاحب اسکول کی فیس برداشت کرنے کے قابل نہ تھے۔ مجھے اسکالرشپ حاصل کرنے کے لیے میمن ویلفیر سوسائٹی میں درخواست دینے کے لیے کہا گیا، میں نے درخوست جمع کرا دی جو منظور ہو گئی اس شرط پر کے جب میں اسقابل ہو جاؤں گا تو پوری رقم انہیں واپس کر دوں گا تا کہ دوسرے مستحق طلبا اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ہمارے اسکول کے سیکریٹری عبد الرحمٰن چھاپڑا صاحب کا تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی کافی زور تھا، ہر کچھ دنوں کے بعد کسی نہ کسی معلوماتی یا تقریری مقابلے، ڈرامے یا مشاعرے وغیرہ کا انعقاد ہوتا رہتا۔ پانچ جماعتیں، چھٹی سے دسویں تک ایسی تھیں جن کے درمیان لکڑی کے پھٹوں کا پارٹیشن تھا، جب بھی کوئی پرگرام ہوتا انٹرول سے پہلے بیچ میں سے یہ پارٹیشنز ہٹا دیے جاتے اور ایک

لمبا سا ہال بن جاتا۔ اسی طرح کا انگریزی الفاظ کے ہجے کرنے کا ایک مقابلہ میں نے جیتا تھا جس کے انعام کے طور پر مجھے ایک کتاب ملی تھی، اسی طرح کے ایک اسلام سے متعلق معلوماتی مقابلے میں جس میں قرآن اور حدیث کے بارے میں مختلف سوالات پوچھے گئے تھے میرا ہم جماعت سلیم چھاپرا جیتا تھا، جبکہ میرا صرف ایک سوال کا جواب غلط ہوا تھا، وہ سوال مجھے آج تک یاد ہے، قرآن میں قال فما خطبکم سے شروع ہونے والا کون سا پارہ یا باب ہے؟ اسکا صحیح جواب تھا ستایسواں پارہ۔

کئی سالوں سے ہم اپنے والد سے بینائی کی کمزوری کی شکایت کر رہے تھے، میرے چچا ڈاکٹر احمد موٹن کو جب اسکا پتہ چلا تو انہوں نے ایک لمبا چوڑا لیکچر میرے والد کو سنا دیا اور اپنے ایک دوست کا ذکر کیا جو ماہر امراض چشم تھے۔ آخر کار ۱۹٦۷ میں میرے والد ہم دونوں بھائیوں کو لے ان کے پاس پہنچے، ہماری آنکھیں ٹیسٹ کرنے کے بعد انہوں نے بتایا کے ہمیں شدید قسم کا مایوپیا ہے، مایوپیا میں قریب کا تو نظر آجاتا ہے لیکن دور کا نہیں۔ جب ہم نے اپنی نئی عنیکیں لگائیں تو ایسا لگا کے دنیا ہی بدل گئی ہے، ایسا لگا کے اللہ کی تخلیق کا حسن پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ عنیکیں لگا کر ہم خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ کلاس میں بلیک بورڈ بھی صاف نظر آنے لگا، توجہ بھی بہتر ہوگئی۔ سانویں جماعت کے سالانہ امتحان میں میں چوتھے نمبر آیا۔

آٹھویں جماعت کا نصاب بہت مشکل تھا، لیکن اب ہمارے پاس عینک تھی اور بورڈ بھی صاف نظر آتا تھا۔ ہمارے پاس کافی مضامین تھے، تمام مضامین کا ہر مہینے ٹیسٹ ہوتا تا کے پتہ چل سکے کہ

بچوں کو مضامین کس حد تک سمجھ آ رہے ہیں، مجھے تاریخ اور جغرافیہ بالکل پسند نہیں تھا، میں نے سوچا کیوں نہ میں اس کے کچھ نوٹس بنا کر ٹیسٹ کے دوران ان سے کچھ مدد لے لوں۔ میں نے یہی کیا، ٹیسٹ کے دوران میں اپنے نوٹس دیکھ رہا تھا کہ کچھ ہم جماعتوں نے ٹیچر سے میرے شکایت لگا دی، ٹیچر نے مجھے نقل کرتے ہوئے پکڑ لیا۔ ٹیچر کو مجھ سے یہ امید نہیں تھی کیونکہ میں ایک اچھا پڑھنے والا شاگرد تھا، انہوں نے مجھے فیل تو نہیں کیا لیکن مجھے خوب ڈانٹ پلائی۔ اس واقعہ سے نہ صرف مجھے پتہ چلا کہ دھوکہ دہی کیا ہوتی ہے بلکہ یہ سبق بھی حاصل ہوا کہ ہر ایک پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہی بچے جنہوں نے میری شکایت لگائی تھی بعد میں وہ میرے گھر مجھ سے ریاضی پڑھنے کے لیے آنے لگے، لیکن میں نے انہیں کبھی کچھ نہیں کہا۔

اسی سال پی ٹی کے ٹیچر نے ہم سب سے وعدہ کیا کہ گرمیوں میں وہ ہمیں سوئمنگ کے لیے، تیراکی کے لیے لے کر جائیں گے۔ فائنل امتحان کے ختم ہوتے ہیں ہم لوگ تیراکی سیکھنے جانے لگے، ہم دونوں بھائیوں نے کافی جلدی تیرنا سیکھ لیا تھا۔

ایک بار جب میرے والد ہمارے ساتھ سفر کے لیے شامل ہوئے تو وہ ہماری کارکردگی سے بہت متاثر ہوئے۔ دکھاوے کے لیے، میں نے چھ فٹ پانی میں ایک اچھا غوطہ لگایا لیکن پانی سے باہر فلیٹ آنے کی بجائے سیدھا اوپر آیا تاکہ میں فری اسٹائل کر سکوں اور آگے بڑھ سکوں۔ زمان سر نے دیکھا اور میری مدد کے لیے قدم بڑھانا چاہا لیکن میرے والد نے انہیں روک دیا۔ میں نے خود ہی ہاتھ

پاؤں چلا کر اپنے سر کو پانی کی سطح سے بلند کر لیا۔ اس دن میں نے خود ہی سیکھ لیا کہ اپنے اپ کو پانی کی سطح سے بلند کیسے رکھنا ہے۔

ایک دن جب ہم تیراکی پر گئے تو میں باہر کھڑا ہوا کچھ دوستوں سے بات کر رہا تھا کہ ہمارے اس وقت کے کلاس ٹیچر سر امجد نے میری تعریف شروع کر دی اور فائنل امتحانات میں میری کارکردگی کو بہت سراہا، اپنے کلاس ٹیچر کی کی زبان سے اپنی تعریف سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی، یہ میرے لیے کافی مسرت اور فخر کی بات تھی۔ جب نتائج کا اعلان ہوا تو میں کلاس میں اول نمبر پر آیا تھا، میرے پورے اسکول کریئر میں یہ ایک قابل ذکر کامیابی تھی۔

آٹھویں جماعت مکمل ہو چکی تھی، میرے دوست توفیق اور محمود اپنی والدہ کے ساتھ لاہور جا رہے تھے، میں نے اور ایک اور دوست سلیم ستار نے بھی لاہور جانے کی خواہش کا اظہار کیا جس پر انہوں نے رضامندی ظاہر کر دی، مجھے بھی گھر سے اجازت مل گئی، والد نے مجھے سو روپے دیے جبکہ دیگر اخراجات کی ذمہ داری توفیق کے والد جناب احمد فاضل صاحب نے لے لی۔ ہم کراچی کینٹ اسٹیشن سے روانہ ہو کر چوبیس گھنٹے میں لاہور پہنچے، جہاں احمد بھائی اپنے باورچی اسلم اور ایک اور ساتھی کے ساتھ ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ احمد بھائی باوانی گروپ آف انڈسٹریز کے لیے پنجاب کا کاروبار سنبھالتے تھے۔ شاہ عالم مارکیٹ میں انکا ایک فلیٹ تھا، یہیں ہم نے چھٹیاں گزارنی تھیں۔ میرے والد کا بھی کام کے سلسلہ میں لاہور، راولپنڈی، گجرانوالا آنا جانا رہتا تھا، انہوں نے ہمیں

پہلے ہی گھومنے والی کچھ جگہیں بتا دیں تھیں جن میں انار کلی بازار، مغل شہنشاہ جہانگیر کا مقبرہ، بادشاہی مسجد، لاہور کا قلعہ اور کچھ دوسری جگہیں بھی شامل تھیں۔

ہر روز ہم ایک بہترین ناشتہ کرتے جس میں تلے ہوئے انڈے، آملیٹ، پکی ہوئی کلیجی، گرم روٹیاں اور ساتھ میں گرما گرم چائے شامل تھی۔ صبح نو بجے کے قریب احمد بھائی اور توفیق اور محمود کی والدہ مریم بائی کے ساتھ ہم لوگ بازار میں خریداری کے لئے نکلتے پھر دوپہر کے کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر عصر کی نماز کے بعد مختلف مقامات کی سیر کو نکل جاتے۔ ایک دن ہم نے احمد بھائی سے راولپنڈی اور مری جانے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے روالپنڈی میں اپنے ایک دوست سے رابطہ کیا اور باورچی اسلم کے ساتھ ہمیں راولپنڈی کی ٹرین میں بٹھا دیا۔پنڈی میں دیکھنے کو کچھ نہیں تھا، رات رک کر دوسرے دن صبح صبح ہم بس میں بیٹھ کر مری کے لیے روانہ ہو گئے۔ بس میں پنڈی سے مری تک کا سفر شاید دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں، دوپہر کے قریب ہم مری پہنچ گئے، ہم نے پروگرام بنایا کے شام تک مری کی پہاڑیوں کی سیر کریں گے اس کے بعد بس پکڑ کر واپس پنڈی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ مری ایک نہایت خوبصورت پہاڑوں اور ہریالی سے بھرا ہوا پر فضا مقام ہے، جولائی اگست میں موسم بھی بہت اچھا ہوتا ہے۔

مری میں ایک ہی روڈ ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتی ہے، جو گھومنے کی اصل جگہ ہے، یہ مال روڈ کہلاتی ہے، اسی پر سارے ہوٹل، کھانے پینے اور شاپنگ وغیرہ کرنے کی دوکانیں واقع ہیں۔ ہم اسی روڈ پر گھوم رہے تھے کے اچانک میری نظر اپنے قرآن کے استاد قاری ضیاء الدین پر پڑی جو

اپنے طلبا کے ساتھ جنوبی پاکستان کے دورے پر تھے، انہوں نے نہایت احترام کے ساتھ اپنے طالب علموں سے مجھے متعارف کرایا اور انہیں بتایا کہ کس طرح میں نے ایک عربی ڈرامے میں ایک کردار کیا تھا جس میں ایک بادشاہ کے سامنے مجھے اس کے سوالوں کے جواب نہایت ذہانت سے پیش کرنے تھے۔

ہمیں بس اسٹیشن پہنچنے میں تھوڑی دیر ہو گئی تھی، ہم پریشان تھے کہ کہیں آخری بس نہ نکل گئی ہو، لیکن خوش قسمتی سے جب ہم پہنچے تو آخری بس جانے کے لیے تیار تھی ہم اس میں سوار ہو کر واپس پنڈی کے لیے روانہ ہو گئے۔ رات جب پنڈی پہنچے تو بہت تھک چکے تھے، کھانا کھا کر سب سونے کے لیے لیٹ گئے، دوسرے دن ہمیں واپس لاہور جانا تھا۔ لاہور کی ٹرین کا ٹائم شاید تین چار بجے کا تھا، ہم لوگ تھوڑی دیر سے اٹھے، ناشتہ سے فارغ ہو کر ٹرین اسٹیشن پہنچے اور لاہور کی ٹرین میں بیٹھ گئے۔ رات کچھ دیر سے لاہور پہنچے اور تانگہ (گھوڑا گاڑی) کر کے شاہ عالم مارکیٹ پہنچے۔ لاہور میں احمد بھائی کے ایک دوست نے ہمیں کھانے پر بلایا ہوا تھا۔ نہایت شریف آدمی تھے، نام یاد نہیں رہا، لاہور کے نواح میں انکا ایک خوبصورت کوٹھی (محل جیسا گھر) تھا۔ کھانے میں لاہور کی سگنیچر ڈش لسی (چینی کے ساتھ دودھ اور دہی کا امتزاج) اور اخیر میں سویٹ ڈش شامل تھی۔ کھانے میں خوب لطف آیا۔ لاہور کے پسندیدہ مقامات کی سیر تقریباً مکمل ہو چکی تھی، تصاویر وغیرہ بھی کافی کھینچ لی تھیں۔ ہم شام کو باورچی اسلم کے ساتھ انار کلی بازار کا چکر لگانے نکل جاتے، یہاں لسی اور آم کے مشروبات کی کئی دکانیں تھیں ہم روزآنہ کسی نہ کسی نئی دکان کی لسی یا جوس ٹیسٹ کرتے۔

روانگی کا وقت قریب آگیا تھا، میرے پاس ایک ڈائری ہوتی تھی جس میں میں روزآنہ کے نوٹ لیتا اور رات سونے سے پہلے دن بھر کی سرگرمیاں لکھتا، یہ دیکھ کر احمد بھائی میری انتظامی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے، انہوں نے سامان کی دیکھ بھال میرے ذمہ لگا دی اور مجھے کہا کے سارے سامان کی اقسام اور تعداد اپنی ڈائری میں نوٹ کر لوں تاکہ لاہور سے نکلتے وقت اور کراچی پہنچ کر سامان کی گنتی پورِی ہو سکے، بد قسمتی سے میری ساری محنت اکارت ہوگئ کیونکہ وہ ڈائری اسٹیشن جاتے ہوئے میں فلیٹ پر ہی بھول گیا۔ بعد میں احمد بھائی نے بذریعہ ڈاک مجھے بھیجی جو کافی عرصہ بعد ملی۔ انہوں نے میرے خرچے کا پرچا بھی میرے ہاتھ روانہ کیا تھا جو میں نے والد صاحب کو دے دیا، والد صاحب نے پرچے کے مطابق رقم دے کر مجھے مریم بائی کو دینے کی ہدایت کی اور بیٹے کی طرح خیال رکھنے پر انکا شکریہ ادا کرنے لیے کہا۔

میں نے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کے لیے چند کھلونے خریدے تھے۔ ان میں ایک ٹرین تھی جو میں نے اپنے بھائی ابراہیم کے لیے خریدی تھی، جس سے ہم سب مل کر کھیلتے تھے۔ سفر کی تصاویر بھی اچھی آئی تھیں۔ ان میں سے کافی میرے پاس آج بھی موجود ہیں۔ واپس آنے کے بعد ہمیں ورزش پر (بھولو کا اکھاڑہ) جانے کے لیے دوبارہ اپنا شیڈول ایڈجسٹ کرنا پڑا۔ اکھاڑے کا سپروائزر ایک میمن تھا جو ہر وقت اپنی باڈی بنانے میں مصروف رہتا تھا اور ہمیں بھی باڈی بنانے کی ورزشیں اور مختلف ترکیبیں سکھاتا رہتا تھا۔

جب میں نویں جماعت میں آیا تو میرا خیال تھا کہ میں پڑھائی پر خوب دھیان دوں گا اور سالانہ امتحان میں اچھے نمبر لے کر آؤں گا، لیکن ہوا کچھ یوں کہ مجھے ایک لڑکی پسند آگئی، میں خوابوں کی دنیا میں رہنے لگا، اسکی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بیتاب رہتا، کبھی ماں سے ضد کر کے دو آنے نکلواتا اور نانی کے گھر کے قریب نکڑ پر ایک مٹھائی والے سے ایک میٹھا سموسہ خرید کر کھاتا، صبع اپنی بہنوں کو اسکول بھی لے جانے لگا کیونکہ وہ بھی اسکول آتی تھی، کبھی شام کی ٹھنڈی ہوائوں میں تاج محل مارکیٹ سے گزرتا ہوا حاجرہ بائی منزل پہنچ جاتا جہاں میرے دوست جمع ہوتے، لیکن میں اس لڑکی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے چھت پر چڑھ جاتا اور اس انتظار میں رہتا کے شاید کبھی وہ نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھ لے، اس زمانے میں نظریں ملنا ہی کافی ہوتا تھا، میری حالت کچھ ایسی تھی کہ جب بھی اسے دیکھتا دل کی دھڑکن بڑھ جاتی، بقول کسی نامعلوم شاعر

کچھ اسکے پاؤں کی آہٹ بھی ہے دھڑکن جیسی

کچھ میرا ذوقِ سماعت بھی بہک جاتا ہے

راہِ وفا میں لٹا کر متاع قلب و جگر

کیا ہے تیری محبت کا حق ادا میں نے

یا پھر

آپ سے مل کر ہم کچھ بدل سے گئے

شعر پڑھنے لگے، گنگنانے لگے

مجھے ہندوستانی گانے سننے کا بھی شوق چڑھ گیا، بڑی مشکل سے ماں اور چچا کو ایک ریڈیو خریدنے پر راضی کیا تاکہ ہم آکاش وانی ریڈیو اسٹیشن سن سکیں، خوش قسمتی کہیں یا بد قسمتی جہاں ہم رہتے تھے وہاں آس پاس مارواڑیوں کی بہت بڑی آبادی تھی، انہوں نے گلیوں میں ہر طرف بڑے بڑے اسپیکر لگائے ہوتے تھے جن پر ہر وقت ہندوستانی گانے بجتے رہتے تھے، ایک سے بڑھ کر ایک گانا، آج بھی مجھے ۱۹۶۹ سے ۱۹۷۱ کے گانے بہت پسند ہیں، جب بھی سنتا ہوں یادوں میں کھو جاتا ہوں، کتنے تو مجھے ابھی بھی یاد ہیں۔ بات اچھی لگنے سے نکل کر محبت تک جا پہنچی تھی، لیکن شاید یہ یکطرفہ محبت تھی۔

اس یکطرفہ عشق کے چکر میں، میں پڑھائی سے غافل ہو گیا۔ نویں جماعت کا نتیجہ آیا تو میں نے ۵۹ فیصد نمبر حاصل کیے جو کسی بھی لحاظ سے اچھے نہ تھے، مجھے اپنا انجینیر بننے کا خواب ادھورا لگنے لگا۔ نتیجہ دیکھ کے لگا جیسے میں خواب سے جاگ گیا ہوں۔ کلاس میں میرے ایک ساتھی اسلم سورتی نے، جسکا شمار پہلے پانچ بہترین طالب علموں بھی نہیں ہوتا تھا حیرت انگیز طور پر سب سے زیادہ نمبر حاصل کر لیے۔ میں نے اور میرے بھائ اشرف اور اسلم سورتی نے فیصلہ کیا کے دسویں جماعت کے لیے ہم سب مل کر پڑھا کریں گے۔ ہم دونوں بھائی روز آنپیدل کیپری سنیما کے قریب اسلم کے گھر جاتے اور کم از کم دو سے تین گھنٹے مختلف مضامین پڑھتے۔ میری ریاضی اچھی تھی میں ریاضی پڑھاتا، اسلم کی انگریزی اچھی تھی وہ گرامر پڑھاتا، بعد میں ہمیں پتہ چلا کے اسلم کے والد اس سے

زیادہ تر انگریزی میں بات کیا کرتے تھے، انکا تعلیم کے سلسلے میں دوسرے ممالک آنا جانا بھی تھا۔ ہم نے دوسرے مضامین مثلا فزکس اور کیمسٹری پر بھی خصوصی دھیان دینا شروع کر دیا یہاں تک کے ۱۹۷۰ کا سال اپنے اختتام کو آپہنچا ہم امتحان دے کر فارغ ہو چکے تھے اور نتیجے کے انتظار میں تھے۔

میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ اگر میرا امریکہ جانا ہو گیا تو وہاں کیا کروں گا ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھنا شروع کر دی، گو کے سائنس کے اسٹوڈنٹ کو ٹائپنگ سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن میں نے سوچا امریکہ میں بجائے الٹے سیدھے کام کرنے کے بہتر ہو گا کہ ٹائپسٹ یا اسٹینوگرافر کی نوکری کر لی جائے۔ چھٹیاں چل رہی تھیں، والد صاحب ہم دونوں بھائیوں کے پیچھے پڑ گئے کے وقت ضائع ہو کرنے سے بہتر ہے کہ کہیں نوکری کر لو۔ میرے ماموں مجید تار نور سلک ملز کے جنرل مینیجر تھے، انہوں نے مجھے بطور ٹائپسٹ کلرک رکھ لیا۔ دفتر میری ویدر ٹاور کے قریب تھا، اوقات صبح 9 بجے سے شام 5 بجے تک ہوتے تھے۔ بندر روڈ سے میں وہی بس پکڑتا تھا جو میرے والد لیا کرتے تھے، آج بھی یہ بس اسٹاپ مجھے یاد دلاتا ہے کہ ہمارے والد نے ہمیں ایک بہتر زندگی دینے کے لیے کیا کچھ جد و جہد کی تھی۔

مجید ماموں نے مجھے ایکسپورٹ ڈاکومنٹیشن، برآمدی دستاویزات بنانا سکھائیں اور دوسری ضروریات وغیرہ سے آگاہ کیا۔ یہاں مجھے پتہ چلا کہ یہ ایک طرح کا معاہدہ ہے جو اس وقت ۱۰ روپے سے لے کر ۱۰۰ روپے تک کے بانڈ پیپر پر ٹائپ ہوا کرتا تھا۔ ٹائپنگ میں اگر ذرا سی غلطی ہو جائے تو پورا بانڈ پیپر

ظائع ہوجاتا ہے، جس کا مطلب ہے کمپنی کا مالی نقصان۔ جلد ہی میں نے درست طریقے سے ٹائپ کرنا سیکھ لیا۔

میٹرک کے امتحانات کے نتائج کے اعلان کی تاریخ تو یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ دوپہر کا وقت تھا، مجھے دفتر میں اس کی اطلاع ملی, میں نے فورا ضمیمہ خرید کر اپنا رول نمبر تلاش کیا اور یہ دیکھ کر کے میری فرسٹ ڈویزن آئی ہے میری خوشی کی انتہا نہ رہی، ماموں بھی یہ سن کر بہت خوش ہوئے انہوں نے فورا کسی کو بھیج کر مٹھائی منگوائی اور ہم نے مٹھائی کے ساتھ گرما گرم چائے کا خوب لطف اٹھایا۔

چائے پر یاد آیا کہ دفتر میں ایک دفعہ ایک ورکر بیمار پڑ گیا تھا، ماموں نے مجھے چائے کا آرڈر دینے کا کہا، دفتر کے نیچے ایک اچھا ریستوراں تھا، میں نے چائے آرڈر کر دی، مجھے نہیں پتہ تھا کہ یہ بہت مہنگا ہو گا، جب چائے کا بل آیا تو ماموں نے مجھے سمجھایا کہ ورکروں کے لیے چائے اسٹال سے آرڈر کرتے ہیں جو سستی ہوتی ہے مہنگے رستورانوں سے نہیں، شام کو ماموں مجھے لے کر کمپنی کے مالک حاجی نور محمد سے ملنے پہنچ گئے جو قریب ہی کپڑا بازار میں اپنے کپڑے کی دوکان پر بیٹھا کرتے تھے، ماموں نے اپنی جیب سے انہیں مہنگی چائے کے پیسے ادا کیے، اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ انسان کو اپنی چادر دیکھ کر پائوں پھیلانا چاہیے۔

مجھے کام کرتے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا، والد صاحب میری تنخواہ کے منتظر تھے، انہوں نے ماموں سے رابطہ کیا تو ماموں نے کہا میں نے تو اسے کام سیکھنے کے لیے رکھا تھا، جیسے انٹرن شپ ہوتی ہے جس میں لوگ رضاکارانہ طور پر کام کرتے ہیں، یہ سن کر میرے والد پریشان ہو گئے، دوسرے دن وہ

مجھے فاروق ٹیکسٹائل مل اپنے باس مسٹر غلام احمد اسماعیل کے پاس لے گئے جنکا دفتر میکلوڈ روڈ پر واقع تھا جو اب آئی آئی چندریگڑھ روڈ کہلاتا ہے، انہوں نے مجھے اپنے شئیر ہولڈرز کے دفتر میں ٹائپسٹ کے طور پر رکھ لیا۔ اس دفتر کا نظم و نسق نظام صاحب چلایا کرتے تھے، یہاں مجھے شئیر ہولڈرز کے شئیر سرٹیفیکیٹ ٹائپ کرنے کا کام سونپ دیا گیا۔ میرے ایک فرسٹ کزن زکریا موٹن نے بھی اس کمپنی میں بطور ایکسپورٹ مینیجر جائن کر لیا، ان کی میز اسی ہال میں تھی جہاں مجھے میز دی گئی تھی۔ وہ ایک بہترین انسان تھے، ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا، خاص طور پر آفس کے آداب و اخلاقیات وغیرہ۔ انہوں نے اسکول کے دوران بھی ہم سب کو رہنمائی فراہم کی تھی، کبھی کبھی چائے کے وقفے کے دوران وہ مجھے اور میرے مینیجر نظام صاحب کو باہر ریسٹوراں لے جاتے جہاں ہم چائے کے ساتھ ساتھ مٹن پیٹیس بھی کھایا کرتے تھے۔ انہیں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مہینہ کیسے گزرا پتہ ہی نہیں چلا، مجھے میری خدمات کے عوض ۱۲۵ روپے تنخواہ موصول ہوئی۔

اگلے دن میں اسکول گیا اور میٹرک کی مارکس شیٹ حاصل کی اللہ کا شکر تھا کہ نمبر اچھے تھے، ریاضی جو میرا پسندیدہ مضمون تھا اس میں میرے ۹۴ فیصد نمبر تھے، لیکن بعد میں ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے بتایا کے سب سے زیادہ نمبر اشرف ستار نے حاصل کیے ہیں جو ۹۵ فیصد تھے۔ میں نے فوری طور پر ڈی جے سائنس کالج میں داخلے کا فیصلہ کیا، ڈی جے کا شمار پاکستان کے بہترین کالجوں میں ہوتا تھا یہ میرا ایک طرح کا خواب بھی تھا۔ کئی لوگوں سے پتہ چلا کہ اگر آپ کے کل نمبر ۶۲۰ سے کم ہوں تو ڈی جے میں داخلہ ملنا بہت مشکل ہوتا ہے جبکہ میرے نمبر ۶۰۹ تھے۔ دوسرا طریقہ تھا اسپورٹ یسس پر داخلہ، مطلب اگر اپ کو کسی کھیل میں مہارت حاصل ہے، مثلاً تیراکی، ٹیبل ٹینس،

فیلڈ ہاکی، کرکٹ وغیرہ تو آپ اس کھیل کا مقابلہ جیت کر داخلے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ ہم دونوں بھائی تیراکی میں اچھے تھے، ہم نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا اور تیراکی کی بنیاد پر داخلے کی درخواست بھر دی۔ اس مقابلے میں مختلف اسکولوں کے طلباء نے شرکت کی، ہم دونوں بھائیوں میں سے کوئی بھی کامیابی حاصل نہ کر سکا صرف بی وی ایس پارسی اسکول کے تین طلبا فائنل تک پہنچے۔ اب داخلے کا ایک ہی طریقہ باقی تھا، کل نمبروں کی بنیاد پر۔

اگست ۱۹۷۰ کے اخیر میں، میں ڈی جے سائنس کالج میں داخلے کی درخواست دینے گیا، وہاں ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی، درخواست گزاروں کو انکے کل نمبروں کے لحاظ سے بلایا جا رہا تھا، کال ۷۱۰ سے شروع ہوئی، میرے ۶۰۹ نمبر تھے۔ میرے ساتھ اشرف ستار موتی والا بھی تھا، مجھے اسکے صحیح نمبر یاد نہیں لیکن میرے نمبروں کے آس پاس ہی تھے۔ خوش قسمتی سے دوپہر کے بعد ہمارے نمبروں کی باری آہی گئی، ہمارے علاوہ ایک اور طالب علم غلام عباس پیار علی کو بھی بلا لیا گیا۔ بعد میں ہماری عباس سے بہت اچھی دوستی ہو گئی۔

انہیں دنوں میری چھوٹی بہن محمودہ نے بی یم بی ٹوڈلر اسکول جانا شروع کر دیا جو میرے کالج کے راستے میں ہی پڑتا تھا۔ میں کالج جاتے ہوئے محمودہ اور اپنے ایک اور بھائی جو اس سے ایک سال بڑا تھا ابراہیم کو اسکول چھوڑتا ہوا کالج چلا جاتا۔ کالج اسکول سے بالکل مختلف تھا، ایک ہی کلاس میں پڑھنے کے بجائے مختلف کلاسوں میں بھاگنا پڑتا ہے۔ اساتذہ کے پڑھانے کا انداز بھی مختلف ہوتا ہے، بعض نہایت قابل، سمجھدار اور پڑھائی کے معاملے میں بہت سنجیدہ تھے۔ ہمیں اس قسم کی

تعلیم کی عادت نہیں تھی لیکن پھر بھی اچھی لگتی تھی۔ دوپہر کے وقفے کے دوران میں اور اشرف ستار کالج کے اندر کونے پر واقع کینٹین سے لنچ کے لیے کچھ سینڈوچ اور کوک وغیرہ لے لیتے، دوپہر کو زیادہ تر فزکس اور کیمسٹری کے لیب سیشن ہوتے تھے جو میں اکثر چھوڑ دیتا تھا۔

کالج کے پہلے ہی سال ہم نے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جانے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ والد صاحب کے ایک دوست یونس موٹن نے ہمیں مزید ترغیب دی کہ امریکہ جا کر تم اچھی تعلیم بھی حاصل کر سکو گے اور گھر والوں کو پیسے بھی بھیج سکو گے۔ ایک دن ہم یونس موٹن کے چھوٹے بھائی عبداللہ موٹن سے ملنے گئے جو امریکہ سے پاکستان آئے ہوئے تھے اور برنس روڈ کے قریب ایک اپارٹمنٹ میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ یہ مجھ سے چند سال بڑے تھے انہوں نے ہمیں بہت سی کام کی باتیں بتائیں، انہوں نے امریکہ کے اسکولوں میں داخلہ لینے کا طریقہ بتایا، یہ بھی بتایا کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ پیسے کیسے کمائے جا سکتے ہیں اور وہ کون سے ایسے شعبے ہیں جن میں کام آسانی سے مل سکتا ہے۔ ان ہی میں ایک شعبہ لیتھ مشین آپریٹر کا بھی تھا۔ میرے والد صاحب نے اپنے ایک جاننے والے سے بات کی جنکا لارنس روڈ پر اقبال انجینیرنگ کے نام سے ورکشاپ تھا، وہ ہمیں لیتھ مشین کا کام سکھانے پر رضامند ہو گئے۔ ہم پڑھنے کے علاوہ بحریہ کے سوئمنگ پول میں تراکی کرتے اور ہفتہ اتوار اقبال انجینیرنگ میں لیتھ مشین کا کام سیکھنے جانے لگے۔

اسی دوران میں نے سوچا کہ پاسپورٹ کے لیے بھی درخواست دے دی جائے۔ درخواست بھرنا کافی آسان تھا اور پاسپورت کی فیس بھی زیادہ نہیں تھی، صرف ۲۵ روپے، اس وقت کے ۲۵

روپے کم بھی نہیں ہوتے تھے لیکن ایک شرط اور تھی کہ درخواست پر گورنمنٹ کے کسی اعلیٰ عہدیدار کے دستخط ہونے چاہئیں۔ میرے ایک دوست کے والد بحریہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، میں نے اس سے ذکر کیا تو اس نے اپنے والد سے بات کی اور دستخط کرنے پر راضی ہو گئے۔ انکا گھر پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی میں تھا۔ میں نے سعید منزل سے پی ای سی ایچ ایس جانے کے لیے بس پکڑی، بس اتنی بھری ہوئی تھی کہ میں پائدان پر لٹک رہا تھا، صدر کے قریب آکر ایک موڑ کے دوران بس ایک گھوڑا گاڑی کے اتنے قریب سے گزری کہ اس میں لگی ہوئی ایک بڑی سی کیل میری پشت سے رگڑکھا گئی، اللہ کا شکر ہے کہ میں زیادہ زخمی نہیں ہوا لیکن قمیض پھٹ چکی تھی۔ پھٹی ہوئی قمیض کے ساتھ تو میں دوست کے گھر نہیں جا سکتا تھا اس لیے قمیض بدلنے واپس گھر گیا اور دوبارہ بس میں بیٹھ گھر مطلوبہ بس اسٹاپ پر اتر گیا۔ چند لوگوں سے پوچھنے کے بعد مجھے انکا گھر مل گیا۔ میرا دوست اور اسکے والد بڑے اخلاق سے ملے اور دوست کے والد نے بغیر کسی تردد کے میرے پاسپورٹ کے فارم پر دستخط کر کے مہر ثبت کر دی۔ میرے والدین خوش تھے کہ میں اپنی ذمہ داریاں خودنباہ رہا ہوں لیکن ساتھ میں بس والے واقعے کی وجہ سے تشویش میں بھی تھے، میں دوسری دفعہ موت کے منہ سے بچا تھا پہلی دفعہ جب پیدائش کے بعد مجھے اسہال ہوئے تھے اور میرے بچنے کی امید کھو چکی تھی اور دوسری دفعہ اس کیل کی وجہ سے اگر یہ زیادہ زور سے لگ جاتی تو میں زخمی ہو کر گر بھی سکتا تھا۔ لیکن خیر اللہ کا شکر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔

اگلے دن مسجد خضرا کے قریب پاسپورٹ آفس پر میں اپنی درخواست دینے کے لیے لائن میں کھڑا تھا، لائن کافی لمبی تھی لیکن کھڑکی زیادہ دور نہیں تھی، میں نے فارم پر لگانے کے لیے ۲۵ روپے کا ڈاک

ٹکٹ خرید لیا تھا، اگر باری آجاتی تو اسی وقت فارم جمع ہو جاتا، اچانک ایک آدمی میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ وہ آسانی سے میرا فارم جمع کروا دے گا، میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی پتہ نہیں کیوں ہامی بھر لی اور فارم اسے دے کر گھر روانہ ہو گیا۔ دوسرے دن جب میں رسید لینے واپس پاسپورٹ آفس گیا تو کلرک نے میرا ریکارڈ نکالا اور کہنے لگا کہ اس پر تو ۲۵ روپے کا ٹکٹ ہی نہیں لگا۔ یہ سن کر میں سخت پریشان ہو گیا اور اس شخص کو ڈھونڈنے لگا جس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، تھوڑی تلاش کے بعد ہی وہ مجھے مل گیا، میں نے اس سے بات کی تو الٹے سیدھے بہانے بنانے لگا اور کسی طرح مجھے چقمہ دے کر نکل گیا۔ کلرک نے مجھے سمجھایا کہ ہر آدمی قابل بھروسہ نہیں ہوتا، انجانے لوگوں سے محتاط رہنا چاہیے۔ لیکن اسکے مشورے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا، نقصان تو ہو چکا تھا۔ بہر حال گھر پہنچ کر میں نے اپنے والد کو پورا واقعہ بتایا، وہ بلکل پریشان نہیں ہوئے، کہنے لگے کہ یہ تمہارے لیے ایک سبق ہے، میں جانتا تھا کہ اس وقت انکے لیے ۲۵ روپے بھی کوئی چھوٹی رقم نہیں تھی، لیکن پھر بھی انہوں نے مجھے دوبارہ ۲۵ روپے دیئے جسے لے کر اگلے دن میں نے بغیر کسی کی باتوں میں آئے ہوئے لائن میں لگ کر خود اپنا فارم جمع کروایا۔

چند دنوں کے بعد شام کے وقت ایک پولیس کانسٹیبل گھر پر میرا پتہ، نام اور تاریخ پیدائش کی تصدیق کرنے آیا، ہمارے کچھ پڑوسیوں نے گواہوں کے طور پر تصدیق نامے پر دستخط کر دیے۔ پاسپورٹ کی رسید پر اسے لینے کی تاریخ لکھی تھی، میں نے مقررہ تاریخ پر پاسپورٹ آفس سے اپنا پاسپورٹ حاصل کر لیا۔ پاسپورٹ ہر لحاظ سے درست تھا، یہ میرا امریکہ کے سفر پر جانے کا پہلا قدم تھا شاید۔

کالج میں میری ملاقات قاسم سورتی سے ہوئی، جسے میرٹ کے بجائے ٹیبل ٹینس کی بنیاد پر داخلہ ملا تھا۔ ہم دونوں ساتھ گھومنے لگے، اسی دوران مجھے تمباکو نوشی کی عادت ہو گئی۔ شام کو ہم مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لیے درخواستیں تائپ کرتے رہتے تھے۔ میرا کالج کی پڑھائی پر سے دھیان اٹھ گیا، ایک ہی دھن سوار تھی کے امریکہ جانا ہے اس لیے پڑھائی ختم کرنے کی کیا ضرورت۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میرے پہلے سال کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں آیا، میں نے درجہ دوئم حاصل کیا اور درجہ اول سے صرف دو نمبروں سے رہ گیا۔ مجھے پتہ چلا کہ میرے دو اور دوست امین فطانی اور اشرف مجید بھی امریکہ کے کالجوں میں داخلے کے لیے درخواستیں دے رہے ہیں۔ اشرف کا بڑا بھائی عارف مجید (محسن) پہلے ہی ہیوسٹن کی بیپٹسٹ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

آخر کار مجھے امریکہ کے ایک کالج میں داخلہ مل گیا۔ اگلے ہی دن میں انگریزی ٹیسٹ کے لیے درخواست دینے کراچی میں امریکی سفارت خانے پہنچ گیا۔ کالج کی ضرورت کے مطابق امتحان پاس ۔کرنے کے بعد، مجھے ویزا کے لیے درخواست دی گئی

میرے والد نے آرام باغ کے قریب ایک چھوٹے سے علاقے میں اپارٹمنٹ خریدنے کے لیے کچھ رقم جمع کرائی تھی۔ رنچھور لائنز میں جس ایک کمرے کے گھر میں ہم رہ رہے تھے وہ یقینی طور پر دس بچوں اور دو بڑوں کے لیے بہت چھوٹا تھا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں نے امریکہ کے کالج میں داخلے کے لیے تمام ضروریات پوری کر لی ہیں اور میرا سیمسٹر جنوری ۱۹۷۲ میں شکاگو میں شروع ہو

گا، تو انہوں نے ٹکٹ خریدنے کے لیے مجھے اپنی ساری زندگی کی بچت دینے کا وعدہ کرتے ہوئے اپنی گھر کے لئے دی گئی رقم واپس لینے کا فیصلہ کر لیا۔ ٹیوشن اور تبادلے کی ادائیگی کے لیے رقم کافی تھی

اسی دوران پاکستان کے حالات مزید خراب ہونے لگے۔ الیکشن ہو چکے تھے، ذوالفقار علی بھٹو نے مغربی پاکستان میں زیادہ سیٹیں جیتیں تھیں جب کہ مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمان واضح فاتح تھے۔ اکثریت مجیب الرحمن کے پاس تھی لیکن بھٹو نے ادھر ہم اور ادھر تم کا نعرہ لگا دیا اور خود وزیر اعظم بننے کا فیصلہ کر لیا

پاکستان کی مسلح افواج کی اکثریت مغربی پاکستان سے تعلق رکھتی تھی، فوج نے بنگلہ دیش میں آپرشن شروع کر دیا، مشرقی پاکستان میں بغاوت ہو گئی، بھارت نے بھی انکی بھرپور مدد کی اور ہندوستان پاکستان کی جنگ شروع ہو گئی، پاکستان کو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا مشرقی پاکستان علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا، ۹۶ ہزار پاکستانی فوجی ہندوستان کی قید میں چلے گئے، سی او اے ایس جنرل یحییٰ خان نے اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کیا اور مغربی پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھ دیا گیا

کالج کی پڑھائی میں عدم دلچسپی پیدا ہو چکی تھی، مجھے یقین تھا کہ اگر میں امریکہ نہیں گیا تو ناکامی میرا مقدر ہو گی۔ میں نے کالج میں پہلے ہی گرمیوں کے سیمیسٹر سے شروع کرنے کی درخواست کی ہوئی تھی، اپریل ۱۹۷۲ میں میری ۱-۲۰ موصول ہوئی اور بغیر وقت ظائع کیے میں نے امریکی سفارت خانے میں اپنے ویزا کی درخواست جمع کرا دی۔ میرے ماموں مجید نے اپنے ذرائع سے مجھے بینک گارنٹی کے

کاغذات بنوا دیے اور میرے والد نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدنے اور ٹیوشن کی ادائیگی کے لیے مجھے ۸۵۰۰ روپے دے دیے۔ امریکن سفارت خانے میں میرا انٹرویو ڈاکٹر تھاورنے کیا جو فلوریڈا یونیورسٹی کی ڈین بھی تھیں۔ انٹرویو کے بعد میرا پاسپورٹ لے لیا گیا اور اسے واپس لینے کے لیے مجھے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے دی گئی۔ میری خوشی کی انتہا نہ تھی بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اڑ کر امریکہ پہنچ جاؤں- میرا دوست امین فطانی خوش قسمت نکلا، اسے ویزا بہت پہلے مل چکا تھا اور وہ شکاگو کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ مجھے بھی شکاگو جانا تھا، ادھر اشرف مجید کو اپنے ٹرپ کی فنانسنگ میں کچھ مسائل درپیش تھے لیکن ہم دونوں سمر ٹرم کے لیے پلان کر رہے تھے۔

باب ٦

۱۹۷۲-۱۹۸۵

جنگ ختم ہو چکی تھی، وہ سٹوڈنٹس جنہیں مسلح افواج نے جنگ کے لیے ریکروٹ کیا تھا واپس آنے لگے۔ میں امریکن ایمبیسی میں ای پی ٹی، نگریزی مہارت کا ٹیسٹ دے کر گرمیوں کے سیشن کی آئی ۲۰ کے انتظار میں تھا تاکہ امریکن ویزے کے لیے اپلائی کر سکوں، موسم بہار کا سیشن تو مس ہو ہی چکا تھا، تیاری پوری تھی انٹرنیشنل پاسپورٹ بھی مل چکا تھا۔ اس عرصے میں والد صاحب نے کچھ مزید پیسے جمع کر لیے تھے تاکہ ہم آرام باغ کے نزدیک نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو سکیں۔

الیکشن گزرے بھی کئی مہینے گزر چکے تھے، مشرقی پاکستان ایک نیا ملک بن چکا تھا، انہوں نے اپنا نام بنگلہ دیش رکھ لیا، بھٹو نے تمام اسکول اور انڈسٹریز وغیرہ کو نیشنلائز کر لیا اور طلباء کی ایک پوری نسل برباد ہو کر رہ گئی۔ اردو کو لازمی زبان قرار دے دیا گیا اور انگریزی نایاب ہو گئی۔ میرا پڑھائی سے دل اچاٹ ہونے لگا، میں نے کالج جانا بھی کم کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے سال کے فائنل امتحان کی تیاری کرنا مشکل ہو گیا۔ تاہم میں نے کسی نہ کسی طرح امتحان کی فیس بھر دی اور ایڈمٹ کارڈ حاصل کر لیا۔

پہلی مئی کو میں اپنا پاسپورٹ لینے امریکی سفارت خانے پہنچا اور رسید کھڑکی پر موجود کلرک کے حوالے کی تو وہ بغیر کچھ کہے اندر چلا گیا اور واپس آکر پاسپورٹ میرے حوالے کر دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ شاید میرا ویزہ مسترد ہو گیا ہے، لیکن جب میں نے پاسپورٹ کھول کر دیکھا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی، چار سال کا ملٹیپل اسٹوڈنٹ ویزا میرے پاسپورٹ پر لگا ہوا تھا۔ اچانک دن بھی مجھے خوبصورت لگنے لگا، اب میرے پاس ویزا بھی تھا اور والد کی دی ہوئی رقم بھی تھی۔

جب میں پاسپورٹ لے کر گھر پہنچا اور والد صاحب کو بتایا کہ مجھے ویزا مل گیا ہے تو والد صاحب بہت خوش ہوئے لیکن کچھ افسردہ اور پریشان سے نظر ارہے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ حالات خراب ہونے کی وجہ سے ڈالر کے مقابلے میں پاکستانی روپے کی قدر میں بہت کمی آئی ہے جس کی وجہ سے امریکہ جانے کا خرچہ دگنے سے بھی زیادہ ہو گیا ہے اور یہ کہ اب وہ مجھے امریکہ بھیجنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

یہ سن کر مجھے دھچکا سا لگا، میں سخت پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا کہ ابھی تو بارہویں کلاس کا فائنل امتحان دینا باقی ہے تو کیا مجھے اب کراچی میں نوکری بھی تلاش کرنا پڑے گی؟

میرے پھوپی زاد بھائی زکریا موٹن کو جو خاندان میں سب سے قابل اعتماد شخص سمجھے جاتے تھے جب اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے مجھے دوسرے دن ملنے کو کہا۔ میں انہیں ملنے فنلے ہاؤس پہنچا جہاں ہم نے گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران ایک ساتھ کام کیا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے ایک

دوست سردار محمد سے ملنے کو کہا جو کراچی میں قالین کے بہت مشہور تاجر تھے اور جن سے وہ میرے حالات کے بارے میں پہلے ہی بات کر چکے تھے۔

میں لیاقت اور موتن داس مارکیٹ کے قریب سردار محمد صاحب سے ملنے کے لیے پہینچ گیا۔ سردار صاحب نہایت ہی نفیس اور شریف النفس ادمی لگ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ میرے حالات کے بارے میں زکریا بھائی سے ان کی بات ہو چکی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کے والد صاحب نے بہت پہلے ایسے مستحق طالب علموں کے لیے فنڈ قائم کیا تھا جو امریکہ میں پیشاورانہ کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں۔ مزید تفصیلات میں جائے بغیر انہوں نے اپنے کیشیئر کو دس ہزار روپے نکالنے کی ہدایت کی اور پھر روپے میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ میرے ہاتھ کانپنے لگے کیونکہ میں نے ایک وقت میں چند روپے ہی دیکھے تھے، دس ہزار روپے بہت بڑی رقم تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے پانچ یا دس روپے کا نوٹ الگ سے دیا اور مجھ سے کہا کہ رکشہ لے کر سیدھے گھر جاؤ۔

گھر پہنچ کر جب میں نے اپنے والد کو یہ خوشخبری سنائی تو وہ بھی بہت خوش ہوئے، اور ہم دونوں فورا ہی شکاگو کا ٹکٹ اور زر مبادلہ کا بندوبست کرنے نکل پڑے۔ طے یہ ہوا کہ میں ۲۶ مئی ۱۹۷۲ کو امریکہ کے لیے روانہ ہوں گا۔

تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اس رات میرے پانچوں ماموں، زکریا بھائی اور ان کی فیملی سب گھر پر موجود تھے، پورا خاندان جمع تھا سب جاگ رہے تھے کوئی نہیں سویا، میری والدہ ساری رات روتی

رہیں۔ میرے والد کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو اعلی تعلیم کے لیے امریکہ روانہ کر رہے ہیں، لیکن وہ مجھے بار بار سردار صاحب کا قرض اتارنے کی بھی تاکید کر رہے تھے ساتھ میں ترجیحات بھی بتاتے جا رہے تھے کہ جا کر کام تلاش کرنا اور خاندان والوں کی مدد کرنا۔

غفار ماموں نے مجھے پینٹ میں بیلٹ ڈالنا اور مجید ماموں نے نیک ٹائی باندھنے کا طریقہ سکھایا۔ سردار صاحب نے ہم سب کو ایئرپورٹ لے جانے کے لیے دو گاڑیوں کا انتظام کروا دیا تھا۔ ہم وقت سے پہلے ہی ایئرپورٹ جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں مجھے متلی ہو گئی، غفار ماموں نے ایک دوا خانے پہ گاڑی رکوا کر کوئی دوا خریدی، جسے کھا کر میری طبیعت تھوڑی سنبھل گئی اور میں بہتر محسوس کرنے لگا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہر شخص کو ہوائی اڈے کے اندر جانے کی اجازت تھی پورا خاندان مجھے چھوڑنے ایا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی شہزادے کو رخصت کیا جا رہا ہے۔ مجید ماموں نے مجھے ایک اچھی سی گھڑی تحفے میں دی اور تاکید کی کہ اسے احتیاط سے استعمال کرنا۔ شاید اس لیے کہ ہم نے اپنی ساری زندگی اسکول کے ایک ہی جوڑے میں گزاری تھی، اور کبھی ہاتھ کی گھڑی استعمال ہی نہیں کی تھی۔ جیسے ہی فلائٹ روانہ ہوئی مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا ہے کہ شاید میں اب اپنے گھر والوں کو کافی عرصے تک نہیں دیکھ سکوں گا۔

یہ پی ائی اے کی پرواز ہونے کی وجہ سے ہر چند گھنٹوں بعد مختلف ممالک میں رکتی رہی۔ بعض ممالک میں ہمیں جہاز سے اترنے اور ایئرپورٹ کے اندر گھومنے کی اجازت بھی تھی۔ قاہرہ سے ایتھنز،

فرینکفرٹ اور پھر نیویارک۔ نیویارک سے مجھے شکاگو کی فلائٹ لینی تھی لیکن فلائٹ تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے میری شکاگو کی فلائٹ مس ہو گئی۔ امیگریشن اور کسٹم سے فارغ ہونے تک مجھے لگا کہ میں کافی تھک چکا ہوں۔ بہرحال ہم سارے مسافر پی ائی اے کے کاؤنٹر پر پہنچے جہاں ہمیں بتایا گیا کہ ہم سب کو صبح سویرے کی فلائٹ سے بک کر دیا گیا ہے اور ہمیں ایک رات ہوٹل میں گزارنا ہوگی۔ ہم سب بس میں بیٹھ کر ہوٹل روانہ ہو گئے۔ ہوٹل کی عمارت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ہوٹل کچھ نیا بنا ہوا ہے، کمرہ بھی کچھ چھوٹا تھا لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں جنت میں اگیا ہوں، رنچھوڑ لائن کے اس کمرے سے تو ہزار درجے بہتر تھا۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ میرے آنے کی اطلاع میرے دوست امین کوٹیلی گرام کے ذریعے کر دی گئی ہے۔ ان دنوں رابطہ کرنا بہت مشکل تھا کوئی ای میل یا انٹرنیٹ سروس تو تھی نہیں، میں نے ایک نمبر پر کال کرنے کی کوشش کی جو مجھے ابوبکر اسماعیل نے دیا تھا لیکن کوئی جواب نہیں ملا، امین فطانی کے پاس کوئی فون تھا نہیں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ میں امین سے کیسے رابطہ کروں ۔ اب تو میں صرف اللہ ہی کے رحم و کرم پر تھا، اوریہی دعا مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے کہ کسی طرح میں اپنی منزل تک پہنچ جاؤں۔

خوش قسمتی سے جب ہم شکاگو جانے کے لیے سوار ہوئے تو میرے ساتھ بیٹھے مسافروں میں شکاگو کے ککٹ کاؤنٹی ہسپتال کے ایک معالج بھی بیٹھے تھے۔ یہ پاکستان کے شہر لاہور میں اپنے اہل خانہ سے ملنے کے بعد واپس ارہے تھے۔ میں نے انہیں اپنی کہانی سنائی تو انہوں نے کہا فکر نہ کرو جہاں تمہیں

جانا ہے وہ میرے راستے میں پڑتا ہے میں تمہیں جاتے ہوئے وہاں اتاردوں گا۔ ایئرپورٹ سے ہم نے ٹیکسی لی اور اسے بتایا کہ ہمیں 2 ویسٹ شگاگو ایوینیو جانا ہے، یہ امین کے گھر کا پتہ تھا۔

اپارٹمنٹ کی عمارت اسٹیٹ اور شکاگو ایوینیو کے کونے پر تھی۔ ٹیکسی والے نے عمارت کے سامنے گاڑی روک دی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تم جا کے پہلے اپنی تسلی کر لو میں یہی رکا ہوا ہوں۔ میں نے عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن دروازہ بند تھا، میری سمجھ میں نہیں ارہا تھا کہ میں کیا کروں، گھر سے نو ہزار میل دور نہ جان نہ پہچان، کسی نے مجھ سے کہا کہ کونے میں ایک چھوٹا سا کیفٹیریا ہے اس بلڈنگ کا مالک وہاں ہو گا اس سے جا کر بات کرو وہ تمہیں بلڈنگ میں جانے کی شاید اجازت دے دے۔ لیکن پریشانی کے عالم میں میں نے نیچے ہی سے امین کو زور زور سے آوازیں لگانا شروع کر دی۔ لوگ مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے میرا کوئی اسکرو ڈھیلا ہو۔ اتنے میں اچانک ایک کھڑکی سے ایک سر باہر نکلا اور اس نے کہا کہ میں امین ہوں۔ کیا بات ہے؟ یہ امین موٹن تھے، میں نے بتایا کہ میں امین فطانی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ فورا ہی امین فطانی نیچے آیا، اسے دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی، امین فطانی نے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ یہ تو میرے راستے میں ہی تھا میں ویسے بھی کک کاؤنٹی ہاسپٹل جا رہا ہوں۔

امین مجھے اپنے اپارٹمنٹ میں لے گیا جس کا نمبر ۱۰۵ تھا وہاں امین کے کچھ اور بھی دوست موجود تھے جن سے میرا تعارف کرایا گیا۔ یہ امریکہ میں میرا آغاز تھا۔ اتفاق سے دن اتوار کا تھا اور سب کی چھٹی

تھی، دوپہر کھانے کے بعد امین اور اس کا دوست منیر مجھے میکارمک تھیٹر انڈین فلم دکھانے کے لیے لے گئے، انہوں نے بتایا کہ دوپہر تین بجے پرانی فلم داغ چلے گی جس میں دلیپ کمار ہیرو تھے اور شام چھ بجے گمنام چلے گی جس میں ہندوستانی کامیڈین محمود تھے۔ میں نے دونوں شوز دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جس پر سب رضامند ہو گئے۔ جیسے ہی ہم تھیٹر میں داخل ہوئے میرے کانوں میں ۱۹۶۹ اور ۱۹۷۰ کہ ہندوستانی گانوں کی اوازیں انے لگیں۔ یہ وہی گانے تھے جو ہمارے محلے کے ماروا ڑی مختلف موقعوں پر بجایا کرتے تھے۔ فلم جینے کی راہ کا گانا بج رہا تھا جو مجھے اج بھی یاد ہے

آنے سے اس کے آئے بہار

جانے سے اس کے جائے بہار

بڑی مستانی ہے میری محبوبہ

میری زندگانی ہے میری محبوبہ

آنے سے اس کے آئے بہار

جانے سے اس کے جائے بہار

بڑی مستانی ہے میری محبوبہ

میری زندگانی ہے میری محبوبہ

یہ پہلی دو ہندوستانی فلمیں تھی جنہیں دیکھ کر مجھے خوب لطف آیا۔ اگلے دن میموریل ڈے تھا، پیر ۲۹ مئی ۱۹۷۲ سب کی چھٹی تھی، میرا ایک روم میٹ حلیم مجھے لیک شور ڈرائیو پر لے گیا جہاں میں نے شکاگو میں اپنی پہلی تصاویر اتاریں۔ جب ہم واپس پہنچے تو امین کو میرے چچا مجید ماموں کی طرف سے بھیجا گیا ٹیلی گرام موصول ہوا، جس میں میری آمد کی تاریخ اور وقت بتایا گیا تھا، لیکن اب کیا فائدہ میں تو پہنچ ہی چکا تھا، ل۔ ٹیلی گرام دیکھ کر مجھے ایک دم سے خیال آیا کہ میں نے گھر والوں کو اپنے بحفاظت پہنچنے کی اطلاع تو ابھی تک بھیجی ہی نہیں۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے تو ٹیلی گرام بھیجا اور الگ سے ایک ایروگرام، ایک خط بھی لکھ کر بھیجا اور بتایا کہ کس طرح میں امین اور دوسرے لوگوں کے ساتھ رہ رہا ہوں۔

میرے ایک روم میٹ ممتاز نے مجھے بتایا کہ اسکا باس پلے بوائے ریسٹورنٹ کیفے ٹیریا میں کام کے لیے بندے کی تلاش میں ہے - میرے علم میں نہیں تھا کہ وہ کس قسم کا ریسٹورنٹ ہے، لیکن چونکہ سیمیسٹر شروع ہونے میں ابھی وقت تھا، اسکول کی چھٹیاں چل رہی تھیں اور میں جلد از جلد پیسہ کمانا چاہتا تھا، میں نے ممتاز سے کہا بس مجھے فوراً نوکری دلوا دو، ممتاز نے مجھے اپنے باس سے ملایا جس نے مجھے بطور بس بوائے ملازمت پر رکھ لیا۔

ممتاز ایک نہایت اچھا انسان تھا، اس نے مجھے کام کرنا سکھایا، گھر پر کھانا بنانا بھی سکھایا، مجھے لے کر سوشل سکیورٹی کارڈ دلانے لے گیا، جسے حاصل کرنا اس وقت نہایت آسان تھا۔ سوشل سیکورٹی افس کلرک نے میری درخواست لی اور میرا پہلا سوشل سیکورٹی کارڈ ٹائپ کیا جو اج بھی میرے

پاس ہے۔ اب میں امریکہ میں اپنی نئی زندگی کا اغاز کرنے کے لیے تیار تھا۔ ایک ہفتہ کام کرنے کے بعد مجھے تنخواہ دینے کے لیے آفس میں بلا کر مجھ سے میرے کام کا پرمٹ یا گرین کارڈ مانگا جس کے بارے میں مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔

اسی رات اتفاق سے امین نے مجھے بتایا کہ جان ہینکاک سینٹر کی ۹۵ منزل پر پینٹری مین کی ایک نوکری خالی ہے جہاں امین بھی کام کرتا ہے۔ میں ممتاز کو بتائے بغیر جان ہینکوک میں ڈھائی ڈالر فی گھنٹہ کی ایک اچھی ابتدائی تنخواہ کے ساتھ نوکری پر لگ گیا۔ ممتاز کافی ناراض ہوا کیونکہ اسے کیفٹیریا کی ساری شفٹ خود ہی کرنا پڑ رہی تھی۔

سمر اسکول شروع ہوا تو میں نے چھ کریڈٹ لے لیے، روز صبح سادہ سا ناشتہ کر کے اسکول کے لیے روانہ ہو جاتا جو اسٹیٹ اسٹریٹ پر ہی دو میل کے فاصلے پر بائیں ہاتھ کی طرف واقع تھا۔ دوپہر تین بجے سے ادھی رات تک کام کرتا۔ یہ میرا روز کا معمول تھا، ہفتہ اتوار اسکول کی چھٹی ہوتی تھی اور ایک دن میں کام سے چھٹی کرتا تھا۔

سمر سیشن ختم ہوتے ہی ہمیں اشرف مجید کا فون ایا وہ استنبول میں پھنس گیا تھا اور چاہتا تھا کہ ہم امریکہ آنے کے لیے اسے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خرید کر دیں- امین نے ٹکٹ خرید کر اسے بھیج دیا۔ دو دن بعد اشرف مجید بھی ہمارے پاس شکاگو پہنچ گیا۔ ادھر منیر کے دو اور دوست شبیر اور اقبال، پاک پینٹر کا بیٹا بھی شکاگو پہنچ گئے اور ہمارے ساتھ رہنے لگے۔ لوگ کچھ زیادہ ہو گئے اور اپارٹمنٹ چھوٹا پڑنے لگا۔

امین اور منیر نے مجھے بتایا کہ ہمیں کسی دوسری جگہ فرنشڈ اپارٹمنٹ کرائے پر لینا پڑے گا کیونکہ ٹو ویسٹ شکاگو ایونیو رہنے کے لیے خطرناک جگہ بننے لگی تھی۔ یہاں بہت سے لوگ بشمول پاکستانیوں کے غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہو کر رہنے لگے تھے۔ گو کہ ہم چار سالہ ایف ون اسٹوڈنٹ ویزا پر تھے اور اسکول بھی جا رہے تھے لیکن اگر امیگریشن چھاپے وغیرہ مارتی ہے تو ہم بھی پریشانی میں آسکتے ہیں۔ فیصلہ ہوا کہ میں امین اشرف اور غلام عباس جو میرے ڈی جے کالج کے دوست تھے ایک اپارٹمنٹ لیں گے اور منیر شبیر اقبال اور ٹونی تبو بلوچ دوسرا اپارٹمنٹ۔ ہم چار دوستوں کو ایک اپارٹمنٹ مل گیا جس کا ایڈریس ۱۱۱۷ نارتھ ڈئیربورن تھا۔

طے یہ ہوا کہ ہر شخص کرایا اور گروسری کی مد میں امین کو ہر مہینے ۱۰۰ ڈالر ادا کرے گا اور اگر خرچہ زیادہ ہو گیا تو اسی حساب سے سب پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ تنخواہ کے طور پر ہر ہفتے میرے ہاتھ میں ۹۵ ڈالر آتے تھے۔ میں نے ہر مہینے ۱۰۰ سے ۱۵۰ ڈالر اپنے والدین کو قرض ادا کرنے کے لیے باقاعدگی سے بھیجنا شروع کر دیے۔ اور ساتھ ہی ان کے لیے ایک بہتر گھر خریدنے کے لیے بھی پیسے جمع کرنا شروع کر دیے. میں ہر سمسٹر کی ٹیوشن فیس دینے کے لیے بھی پیسے بچا رہا تھا۔ میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ میں اپنی پڑھائی مکمل کروں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

اگست ۱۹۷۲ کے شروع میں جب ہم اسکول کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو برف باری شروع ہو گئی یہ میری زندگی کی پہلی برف باری تھی، میں نے اس کا خوب لطف اٹھایا۔ چند دنوں میں برف باری کے باعث سڑکوں پر برف چمکنے لگی اور مجھے بتایا گیا کہ اب یہ نہیں رکے گی۔ درجہ حرارت ناقابل

برداشت تک کم ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہاں رہنا تو بڑا مشکل ہے کیوں نہ ٹیکساس میں کوئی مناسب ٹیوشن والی یونیورسٹی تلاش کی جائے جہاں درجہ حرارت بھی بہتر اور قابل برداشت ہوگا۔

چھٹی کے دنوں میں ہم زیادہ تر ہندوستانی فلمیں دیکھتے، ہفتے بھر کا کھانا پکا کر رکھتے، کبھی کبھار ہندوستانی گانے بجانے والے ہوٹل میں کھانا کھانے چلے جاتے۔ اہستہ اہستہ مجھے گھر کی یاد ستانے لگی، کئی بار میں رو رو کر اللہ سے دعا کرتا کہ مجھ پر رحم کرے، ۱۸ سال کی عمر میں گھر سے دور، اسکول جانا، کام کرنا، اپنا سارا کام خود کرنا اور گھر پیسے بھیجنا کوئی اسان کام نہ تھا۔

الیکشن کے دن قریب اگئے ہر روز ٹاؤن ہال میں اجلاس ہوا کرتے جہاں ریپبلیکن پارٹی کے رچرڈ نکسن اور سپیرو اگینو انتخابات میں کھڑے ہوئے تھے۔ یہ لوگوں کے سوالات کے جواب وغیرہ دیا کرتے ۔ نومبر ۱۹۷۲ کے انتخابات میں رچرڈنکسن اور اس کے رننگ ساتھی سپیرو اگینو نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ میں نے نکسن اور اگینوں کو جنوری ۱۹۷۳ میں اپنے عہدے کا حلف لیتے ہوئے دیکھا۔

اسی سال موسم گرما میں ہمارے روم میٹس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ہمارے سکول کے ساتھی سلیم غنی دوگن، عبدالرزاق اسماعیل اور اسلم سورتی بھی شکاگو پہنچ گئے۔ میں نے انجینئرنگ میں ۱۳۱ گھنٹے کی تعلیم مکمل کرلی تھی اور ہیوسٹن ٹیکساس میں ساؤتھ ٹیکساس جونیئر کالج میں داخلہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ میری بارویں جماعت کی مارک شیٹ میرے بھائی اشرف نے پاکستان سے مجھے بھیجی جس کے لیے میں اس کا بہت شکر گزار ہوں۔

میں، غلام عباس اور رزاق اسماعیل ایک ساتھ ٹیکساس جانے کا ارادہ کر رہے تھے، امین کو شکاگو سے باہر کسی کالج میں اسکالرشپ مل گئی تھی اس کا بھی جانے کا ارادہ تھا۔ فیصلہ جلدی کرنا تھا۔ رزاق اسماعیل اپنے ایک پی ای سی ایچ ایس کے محلے کے دوست چوہدری مختار کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جو اس وقت ہیوسٹن میں تھا۔

میں نے اسکول کی فیس وغیرہ کے لیے کافی رقم جمع کر لی تھی، میرے والدین نے میرا قرضہ بھی ادا کر دیا تھا، ساتھ ہی ادم جی نگر میں ایک اچھا اپارٹمنٹ بھی خرید لیا تھا۔ رن چھوڑ لائن کے مقابلے میں اس وقت یہ بہت بہتر علاقہ تھا۔

ہیوسٹن جانے سے پہلے ہم سب جان ہینکوک بلڈنگ کی ۹۵ منزل کے ریسٹورنٹ میں جمع ہوئے۔ یہ اگست ۱۹۷۳ کے اختتام کے قریب کی بات ہے، یہاں میرے علاوہ اور بھی کئی پاکستانی کام کرتے تھے جن میں امین فطانی، اقبال پاک پینٹرز کے بیٹے، سلیم ادمانی، تبو بلوچ اور کئی لوگ شامل ہیں۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ میں کس طرح اپنے گاہکوں کو فرانسیسی شیف کی ایک خاص ڈش بیف ویلنگٹن پیش کیا کرتا تھا۔ میں ان خوبصورت یادوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہ بلڈنگ کچھ اتنی اونچی تھی کہ جیسے اسمان پر کام کرنا اور بادلوں کو تیرتے دیکھنا۔

ہیوسٹن پہنچ کر ہم چوہدری مختار کے گھر ٹھہرے جہاں ہمارا تعارف ابوبکر, للی خان, زبیر محمود اور امین محمود سے ہوا، انہوں نے نوکریاں حاصل کرنے میں ہماری بہت مدد کی، مجھے ایک اطالوی ریسٹورنٹ مائیکل اینجیلوس میں بس بوائے کی جاب مل گئی جو ہمارے اپارٹمنٹ ۲۰۵ ایونڈل سے

صرف ایک بلاک پر تھا۔ یہاں ہم ایک بیڈ روم اپارٹمنٹ میں رہتے تھے جس کا کرایہ ہم تینوں عباس رزاق اور میرے لیے ۴۰ ڈالر بنتا تھا۔

واحد ملا، چوہدری مختار اور ابوبکر للی ویٹر تھے جبکہ زبیر اور میں بس بوائے۔ ہمارا کام میزوں سے گندے برتن اٹھا کر واپس کچن میں ڈش واشر کے لیے لانا تھا۔ شفٹ کے اختتام پر ویٹرز اپنی ٹپس کا، بخشش کا حساب کرتے اور ہمیں ہمارا حصہ ادا کر دیتے۔ ہمیں اجرت کے طور پر صرف ۱.۲۵ ڈالر فی گھنٹہ ملتا تھا جو شکاگو میں ملنے والی اجرت سے بہت کم تھا۔

میں نے ساؤتھ ٹیکساس جونیئر کالج میں رجسٹریشن وغیرہ مکمل کر کے داخلہ لے لیا جسے یونیورسٹی اف ہیوسٹن نے خرید لیا اور اس کا نام بدل کر یونیورسٹی اف ہیوسٹن ڈاؤن ٹاؤن کیمپس رکھ دیا۔ مجھے وائی ایم سی اے میں مکمل کیے گئے ۳۱ گھنٹوں کا کریڈٹ مل گیا تھا اس لیے میں نے ۱۲ گھنٹے مزید کریڈٹ کے لیے رجسٹریشن کروا لیا اور کالج پھر سے جانا شروع کر دیا۔

مجھے گھر سے نکلے ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا، گھر کی بہت یاد ستا رہی تھی۔ مجھے پتہ چلا کہ سگریٹ پینے کی وجہ سے میرے والد صاحب کا گلا خراب ہو گیا ہے اور صحیح طرح سے بول نہیں پاتے، وزن بھی کافی کم ہو گیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر احمد خان کو خط لکھا جو میرے چچا ڈاکٹر احمد موٹن کے انتقال کے بعد میرے والد کے معالج تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ برائے کرم اس بات کو یقینی بنائیں کہ کہیں میرے والد کو کینسر تو نہیں ہے اور ڈرا دھمکا کر کسی طرح سے میرے والد کی تمباکو نوشی چھڑوا دیں۔

اسکول جاتے ہوئے ابھی ایک ہی مہینہ ہوا تھا، میرے گھر جانے کی خواہش بڑھتی جا رہی تھی، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اڑ کر پاکستان پہنچ جاؤں، میں نے اپنے گھر والوں کو خط لکھا کہ مجھے ایک ٹیلی گرام بھیجیں جس میں لکھا ہو کہ میرے والد کی طبیعت بہت خراب ہے اور مجھے واپس انا چاہیے، ترکیب کام کر گئی۔ میں ٹیلی گرام لے کر کالج گیا جنہوں نے مجھے موسم بہار کے سمسٹر میں داخلہ دے دیا اور میری ٹیوشن فیس بھی واپس کر دی۔ یہ رقم ٹکٹ خریدنے کے لیے کافی تھی۔

ستمبر کے اخر میں، میں کراچی پہنچ گیا، گھر دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگا کہ کم از کم میرے خاندان کو ایک بہتر گھر مل گیا ہے۔ میرے والد بہت خوش تھے لیکن ساتھ ہی پریشان بھی تھے کہ میں نے اتنا پیسہ ضائع کر دیا انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر احمد کو میرا خط مل گیا تھا اور یہ کہ انہوں نے سگریٹ نوشی بھی چھوڑ دی ہے۔

میرے اسکول کے ساتھی سلیم چھاپڑا نے میری آمد کی خوشی میں اسکول کے تمام دوستوں کو اپنے نئے گھر کریم اباد فیڈرل بی ایریا میں دعوت پر مدعو کیا۔ اس وقت مجھے خیال ایا کہ میں تمام بی ایم بی اسکول کے ساتھیوں کی ایک فہرست بنا کر اور پرنٹ کر کے سلیم چھاپڑا کو بھیجوں گا تاکہ ہم سب ایک دوسرے سے رابطے میں رہ سکیں۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ واپس جا کر سب سے پہلے یہی کام کروں گا۔ میں نے تمام دوستوں سے معلومات اکٹھا کر لیں۔ میرے لیے فہرست پرنٹ کرنا کچھ مشکل نہ تھا اس لیے کہ میں اسکول میں کمپیوٹر لیب میں پنچ کارڈز پر کام کرتا تھا۔ ان پنچ کارڈ سے ۸۰/۸۰ کی فہرست آسانی سے پرنٹ ہو سکتی تھی.

ویڈیو لنک پر ہم میں سے بیشتر ابھی بھی رابطے میں ہیں اور جب بھی موقع ملتا ہے اکٹھا ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ پاکستان میں میرا زیادہ تر وقت اسلم مرچنٹ کے ساتھ گزرتا تھا جو مجھے دن کے وقت اپنے گاہکوں سے اور شام کو اپنے دوستوں سے ملانے لے جاتا۔ رمضان بھی شروع ہو چکے تھے اس لیے گھر سے دیر سے نکلنا ہوتا تھا۔ میں نے اپنے خاندان کے ساتھ رمضان اور عید کا خوب لطف اٹھایا۔ اخر میرے جانے کا وقت نزدیک آگیا، جب میں جانے کے لیے تیار ہوا تو میری سب سے پسندیدہ اور چھوٹی بہن محمودہ نے جو چھ سال کی تھی میری امی سے پوچھا کہ کیا واقعی انور ہمیں دوبارہ چھوڑنے والا ہے؟ یہ سن کر میرا دل ٹوٹ سا گیا، میں بھی اپنے خاندان کو کبھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن اخر کیا کرتا میرے کاندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری تھی جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

۱۹۷۴ کا سال شروع ہو گیا، میں نے واپس آکر فورا ہی مائیکل اینجلوس میں کام کرنا شروع کر دیا۔ کالج بھی آنے جانے لگا، میں پہلے ہی ایک سیمسٹر پیچھے ہو چکا تھا۔ میرے مارکس ریاضی، فزکس، کیمسٹری اور کمپیوٹر سائنس میں تو اچھے تھے لیکن ہسٹری، انگلش اور دیگر کورسز میں مجھے کچھ مشکل پیش آرہی تھی۔ اس وجہ سے میں کچھ پریشان تھا کہ ہیوسٹن یونیورسٹی ڈھائی گریٹ پوائنٹ سے کم قبول نہیں کرے گی۔

اسی سال میں نے ایک استعمال شدہ ۱۹٦٦ کی شیوی امپالہ گاڑی خریدی۔ تعطیلات کے دوران ہم گھومنے کی غرض سے بذریعہ کار نیویارک کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہم راستے میں

مختلف شہروں اور ریاستوں کو دیکھتے ہوئے جا رہے تھے۔ نیویارک میں ہم خوب گھومے اور تمام یادگاریں دیکھیں۔ اس زمانے میں یادگاریں دیکھنے کا کوئی پیسہ نہیں تھا۔

میں نے کمپیوٹر سائنسز میں بیچلرز ڈگری کے لیے ہیوسٹن یونیورسٹی کے شعبہ نیچرل سائنس اور میتھمیٹکس میں درخواست دی جسے منظور کر لیا گیا، ڈگری کی ضرورت پورا کرنے کے لیے مجھے ۱۲۶ گھنٹے کا کریڈٹ چاہیے تھا۔ یہ ایک نہایت ہی محنت طلب کام تھا دن میں اسکول جانا اور رات کو کام کرنا۔ کمپیوٹر سائنس اور ڈیٹا پروسیسنگ کورسز کے پریکٹیکلز کے لیے بھی کئی گھنٹے گزارنے کی ضرورت تھی۔ میں جلد از جلد بیچلرز ختم کر کے ماسٹرز میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔

مائیکل اینجلوز جہاں میں کام کر رہا تھا وہاں کئی مسائل تھے میں نے گروسری سٹورز کے لیے کام کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں معاوضہ کافی کم تھا۔ انور جمال اور ہارون کی مدد سے میں نے سیف وے میں ملازمت کے لیے درخواست دینے کا فیصلہ کیا۔ ان دونوں نے مجھے سٹاک مین کا کام سکھایا۔ اس میں گروسری کے ڈبوں کو ایک خاص کٹر سے کاٹنا اور پھر ہر یونٹ پر قیمتوں کے نشان لگانا شامل تھا۔ یہ کام تھوڑا پرسکون تھا۔

ایک دن میں ویسٹ ہیمر اور بفلو سپیڈ وے کے کونے میں سیف وے سٹور نمبر ۹۰۴ میں گیا، یہاں کے اسٹور میییجر، فریڈ گیمنز کو نائٹ اسٹاکر کی تلاش تھی، اس نے مجھے فورا ہی پانچ ڈالر فی گھنٹے کے حساب سے رکھ لیا۔ آٹھ اکتوبر ۱۹۷۵ رات ۱۰ بجے کام پر میری پہلی رات تھی۔ میرے لیے یہ کام

بہت موضوع اور قدر اطمینان بخش تھا۔ میں رات کو کام کر کے دن میں کالج بھی جا سکتا تھا۔ شروع شروع میں کام کچھ مشکل لگا لیکن تھوڑے ہی عرصے میں مجھے اس کی عادت ہو گئی۔

میں نے یونیورسٹی آف ہوسٹن ڈاؤن ٹاؤن کالج کے نیچرل سائنس اور میتھمیٹکس سے ایسوسی ایٹ کی ڈگری کی ضروریات پوری کر لیں اور اے ایس کی ڈگری کے لیے درخواست بھر دی۔ خوش قسمتی سے میں ڈاؤن ٹاؤن کیمپس سے اے ایس کی ڈگری حاصل کرنے والے پہلے گریجویٹس میں شامل ہوں۔ گریجویشن کی تقریب مئی ۱۹۷۶ میں منعقد ہوئی، میرے بہت سے دوستوں نے اس میں شرکت کی۔

میرے اسٹور مینیجر فریڈ گیمنز بیمار پڑ گئے اور ان کی جگہ لیڈی ہینکنز نے لے لی۔ جب اسے پتہ چلا کہ میں اسکول جا رہا ہوں اور گریجویٹ ہونے میں صرف دو سال باقی ہیں تو اس نے مجھے ایکسٹینڈڈ اسٹور لیول سکیننگ سسٹم جسے قیمت تبدیل کرنے کے لیے ڈاؤن لوڈ کرنا پڑتا ہے اس میں مدد کرنے کی درخواست کی، میں نے ہامی بھر لی اور میری تنخواہ بھی بڑھا دی گئی اور میں اپنے والدین کو مزید رقم بھیجنے کے قابل ہو گیا۔

یہاں میری ملاقات ایک ادھیڑ عمر کی خاتون سے ہوئی جن کا نام میلوا گلبرتھ تھا۔ میرے اور میرے حالات کے بارے میں جاننے کے بعد وہ مجھ سے نہایت شفقت اور مہربانی سے پیش آنے لگی اور بالکل اپنے بیٹے کی طرح میرا خیال رکھنے لگی۔ میری زندگی میں بھی ایک ماں جیسی شخصیت کا اضافہ ہو گیا۔ ایک دن اس نے مجھے اپنے خاندان سے متعارف کرانے کے بعد اتوار کے دن چرچ آنے کی

دعوت دی۔ میں کوئی دو بار چرچ گیا جہاں میں نے ان کے مذہبی رہنماؤں کی تقاریر اور وعظ وغیرہ جن میں زیادہ تر انجیل سے اقتباس وغیرہ ہوتے تھے سنے۔ انہیں سننے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ عیسائی مذہب اور سوچ اسلام سے کافی قریب ہے، مجھے مقدس بائبل کا ایک نسخہ بھی دیا گیا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں میرے پاس کالج کی کتابوں کے علاوہ کچھ اور پڑھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر عیسائی صرف اسلام کا پہلا ستون یعنی توحید پر ایمان لے آئے تو یقینا وہ ایک بہترین مسلمان ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان کے فلاحی اور خیراتی کاموں نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں ان کے ساتھ مل کر فلاحی کاموں میں حصہ لینے لگا۔ خاص طور پر کرسمس کے دنوں میں لوگوں کے عطیات شہر کی غریب ابادیوں میں تقسیم کرنے کے لیے ان کے ساتھ جایا کرتا تھا۔

میرے ایک دوست، حمید زکریا نے اپنی فیملی کو ہیوسٹن مدعو کیا۔ ہم نے کیلیفورنیا کا سفر کرنے اور ان کے والدین کو بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ مغربی ساحل کا میرا پہلا سفر تھا۔ ان دنوں ہم میں سے اکثر کے پاس بہت پرانی گاڑیاں تھیں، جنہیں ہم صرف اسکول اور کام کے لیے استعمال کرتے تھے۔ حمید نے حال ہی میں ایک نئی گاڑی مونٹیکارلو خریدی تھی، جو انتہائی اسمود چلتی تھی۔ لہذا، ہم نے سفر کے لیے اسی گاڑی کا انتخاب کیا۔ مغربی ساحل کی ڈرائیو بہت دلکش تھی۔ ہم لاس اینجلس اور ڈزنی لینڈ گھومے۔ اس کے بعد ہم سان فرانسسکو گئے، جہاں ہم اپنے اسکول کے دوست یاسین صالح محمد سے ملے۔ یہ شہر بہت خوبصورت تھا، جس میں دلکش ساحل اور دریا وغیرہ تھے۔ آخری پڑاؤ رینو، نیواڈا تھا، جہاں ہم حسین اور ان کی اہلیہ سے ملے اور ان کے یہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ میں زندگی میں کسی پیچیدگی کی خواہش نہیں رکھتا

تھا۔ وہاں بہت سی خوبصورت لڑکیاں تھیں، اور ایک نوجوان ہونے کے ناتے لڑکیوں کی صحبت کی خواہش ایک فطری عمل ہے۔ میلوا نے مجھے بتایا کہ کچھ لڑکیاں میرے ساتھ باہر جانا چاہتی ہیں، لیکن بی ایم بی اسکول میں اچھی تعلیم و تربیت اور کچھ اصولوں نے مجھے بہت سی غلطیوں سے بچا کر رکھا۔

لیڈی ہینکنز ایک اچھی منیجر تھی- ۱۹۷۷ کے آغاز میں، انہوں نے مجھے بطور کیشیئر اور بوتھ میں کام کرنے کو کہا، جس میں بہت سے انتظامی فرائض شامل تھے۔ اس اسائنمنٹ نے مینجمنٹ میں میری تعلیم کا آغاز کیا۔ جمعہ، ہفتہ اور اتوار کو کام کرنے کے زیادہ پیسے ملتے تھے، اتوار کو تو ڈیڑھ گنا زیادہ تھے، اس لیے میں ہفتہ میں تین دن سے زیادہ کام نہیں کرتا تھا، جسکی وجہ سے مجھے پڑھائی پر بھی زیادہ دھیان ۔دینے کا موقعہ مل رہا تھا

۱۹۷۷ ہی وہ سال تھا جب ہماری بہن گل بانو کی شادی ابراہیم فطانی سے ہوئی۔ ابراہیم اور اس کا بڑا بھائی کریم، جو میرے کلاس فیلو تھے، ہمارے اسکول کے بالکل سامنے رہتے تھے۔ ہم سب بھائیوں میں سے ہر ایک نے شادی میں والد کی مدد کے لیے ۵۰۰ ڈالر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اچھی بات یہ تھی کہ منور کراچی میں تھا اور شادی میں شرکت کر سکتا تھا۔ اسکا کراچی میں ہونا والد اور والدہ کے بہت کام آیا۔

اس کتاب کو لکھتے ہوئے میں نے بہت سوچا کہ کن باتوں کا ذکر کروں اور کن کا نہیں، لیکن چونکہ میں اس کتاب کو اپنے خاندان کی تاریخ، فیملی ہسٹری بنانا چاہ رہا تھا تو میں فیصلہ کیا کہ اس میں جو کچھ بھی

مجھے یاد ہے اور جو بھی پرانی یادگاریں و تصاویر وغیرہ ہیں سب شامل کر دینا چاہیے تا کہ آئندہ آنے والوں کے لیے ایک مکمل ریکارڈ رہ جائے۔ اسی لیے بہن کی شادی اور ولیمے کا ذکر اور تقریبات کی تصاویر وغیرہ ساتھ لگا دیں ہیں۔ یہ تصویریں آپ کو میری انگریزی کتاب میں ملیں گی۔

جب میں نے کالج کا آخری سمسٹر شروع کیا تو میں نے لیڈی ہینکنز سے درخواست کی کے پڑھائی مکمل کرتے ہی مجھے پکی نوکری پر رکھ لے، جس پر وہ راضی ہو گئی۔ آخر کار، میں نے ساری کلاسز پاس کر لیں اور کمپیوٹر سائنس میں ڈگری مکمل کر لی۔ اس دوران میں ہمیشہ اپنے اسٹوڈنٹ ویزا کی تجدید کرواتا رہا۔ اب اسکول کے دن ختم ہو رہے تھے، میں نے ۱۸ مہینے کے تربیتی ویزے کے لیے درخواست دے دی۔ سوچ رہا تھا کہ اس دوران کافی تجربہ حاصل کر لوں گا اور پھر گھر واپس چلا جاؤں گا۔

جنوری میں گریجویشن کی تقریب ہوئی اور جاب اسسٹنس کے تحت ڈیٹا پوائنٹ کارپوریشن نے مجھے نوکری کی پیشکش کر دی۔ ان کے اکاؤنٹس پر کام کرنا میرے لیے نیا تھا۔ بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ ڈیٹابیس کی زبان کافی مشکل تھی۔ قابل وصول اکاؤنٹس، اکائونٹس ریسوایبلز میرے لیے بالکل نیا تھا۔

اس دوران میں یوگنڈا سے ابراہیم کرمالی اور ان کے خاندان سے ملا۔ وہ اسماعیلی ہندوستانی تھے ان کی ساری عمر کم پالا میں گزری تھی لیکن ایدی امین نے انہیں یوگنڈا سے نکال دیا تھا۔ یہ بہت اچھے لوگ تھے۔ ایک دن ابراہیم کرمالی کی بیوی زہرہ آنٹی نے مجھے بتایا کہ کمپالا سے ایک اور ہندوستانی سنی فیملی آئی ہوئی ہے جن کی میری ہم عمر ایک ہندوستانی لڑکی ہے، مجھے لڑکی سے اور اس کے گھر والوں

سے ملنے کے لیے کہا گیا اور ہم باقاعدگی سے ان کے گھر جانے لگے۔ اس دوران، میرے دوستوں نے کرمالی کے خاندان کو بھی اپنی گریجویشن پارٹی میں مدعو کیا۔ پارٹی میں ایک بوڑھا آدمی تھا جو یوگنڈا میں اسکول کا پرنسپل رہ چکا تھا۔ وہ لڑکی کا چاچا تھا۔

دعوت میں، ہارون جو ہمارا بہت اچھا دوست تھا اور ایک ماہر باورچی گنا جاتا تھا اس نے اپنی پسندیدہ بریانی اور میری پسندیدہ آلو پیٹس بنائی۔ میں نے اپنے والدین سے کئی بار اس بارے میں بات کی لیکن ماں امریکہ میں میری شادی پر راضی نہیں تھی۔ وہ کہتی تھی کہ جب میں واپس آؤں گا تو وہ پاکستان میں میرے لیے کوئی اچھی لڑکی تلاش کرے گی۔

ڈیٹا پوائنٹ پر اسٹوڈنٹ اسسٹنس کے تحت جو نوکری ملی تھی اس کا وقت ختم ہو چکا تھا، مجھے پھر سے نوکری کی تلاش تھی، ایک بار پھر لیڈی ہینکنز نے میری مدد کی اور مجھے وقتی کام دے دیا۔پیسہ اچھا تھا اور کام بھی کمپیوٹر سائنس سے متعلق تھا۔ ایمانداری کی بات ہے کہ میں نے زندگی میں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں کمپیوٹر سائنسز میں پڑھائی اور جاب کروں گا۔ اسکول اور کالج کے شروع میں تو میں نے ریاضی، طبیعات اور کیمسٹری پڑھی تھی اگر میں پاکستان میں ہوتا تو مجھے کسی کمرشل انٹرپرائزز میں جاب ملتی اور میں ۲۰۰ یا ۳۰۰ روپے ماہانہ پر کام کر رہا ہوتا۔

اسی سال کے اوائل میں جب میں اپنی یونیورسٹی کی پڑھائی اور گریجویشن مکمل کر رہا تھا، میرے بھائی اشرف کو بھی امریکہ کا ویزہ مل گیا اور وہ ہیوسٹن پہنچ گیا۔ میرے دوسرے بھائی منور نے اسے

شکاگو آنے کی دعوت دی، لیکن اس نے ہوسٹن میں رہنا زیادہ مناسب سمجھا۔ ہم ایک کمرے میں پہلے ہی چار لوگ تھے رزاق، ہارون، سونی اور میں، اس میں اب اشرف کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

رات سونے سے پہلے اشرف نے مجھے خبر سنائی کہ کراچی میں میری پسند کی لڑکی کی شادی ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ زیادہ انتظار نہیں کر سکتی تھی اور اپنا گھر بسانا چاہتی تھی۔ میں جب ۱۹۷۳ میں پاکستان گیا تھا تو میں نے اپنے والدین سے اس بارے میں بات کی تھی لیکن انہوں نے مجھے شادی کی اجازت نہیں دی اور سختی سے میری درخواست رد کر دی۔ بہرحال یکایک تمام یادیں واپس آگئیں, اور ذہن کے کسی گوشے سے ایک گانے کی اواز آنے لگی

"عجیب داستاں ہے یہ کہاں شروع کہاں ختم

یہ منزلیں ہیں کون سی نہ وہ سمجھ سکے نہ ہم

عجیب راستے ہیں یہ کہاں شروع کہاں ختم

یہ منزلیں ہیں کون سی نہ وہ سمجھ سکے نہ ہم

یہ روشنی کے ساتھ کیوں دھواں اٹھا چراغ سے"

تھوڑے ہی دنوں میں میں نے اپنے بھائی اشرف کی مدد سے بمشکل ڈاؤن پیمنٹ کرتے ہوئے ہیوسٹن میں ویسٹ ۴۳ اور اینٹیوائن پر ایک چھوٹے سے گھر کا سودا کر لیا۔ میرے خیال ہے کہ اپنے

تمام دوستوں میں شاید میں پہلا نوجوان تھا جس نے اپنا گھر خریدا تھا۔ میرے دو چھوٹے بھائی منور اور صمد بھی میرے ساتھ آ گئے جس کی وجہ سے میرے تمام دوستوں کو گھر چھوڑنا پڑ گیا۔

میں نے پہلے ہی بہت سے کمپنیوں کو نوکری کی درخواست اور اپنا ریزیومے بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ ڈیٹا پوائنٹ کارپوریشن کے علاوہ میں نے سائنسی امیجنگ کمپنیوں میں سے ایک کمپنی کے ساتھ بھی کچھ عرصے کام کیا تھا۔ لیکن ابھی تک کوئی ایسی قابل ذکر جاب سامنے نہیں آئی تھی جو کیریئر بنانے کے لیے موضوں ہو۔ ایک بہترین کام جو مجھ سے ہوا وہ یہ کہ میں نے اپنا ریزیومے ہیوسٹن میں کلے اور ونڈفرن پر واقعہ سیف وے کے ڈویژن افس کے ڈیٹا پروسیسنگ ڈیپارٹمنٹ کو بھیج دیا تھا۔ صیف وے میں، میں پہلے سے ہی ان کے اسٹور میں کام کر رہا تھا۔ یہاں مجھے نوکری مل گئی جس کی وجہ سے میں ۱۹۷۸ کے اخر میں اپنے گرین کارڈ کی درخواست دینے کے قابل ہو گیا۔ مارچ ۱۹۷۹ میری گرین کارڈ کی درخواست منظور ہو گئی اور مجھے اسکی رسید دے دی گئی، گرین کارڈ کی منظوری ملتے ہی دوسرے دن میں نے کراچی کے لیے اپنا ٹکٹ بک کرا لیا۔ بھائیوں نے شاپنگ میں میری مدد کی اور میں کوئی ساڑھے پانچ سال امریکہ میں رہنے کے طویل عرصے بعد پاکستان کے لیے روانہ ہو گیا۔

مجھے اتنے سالوں کے بعد دیکھ کر میرے گھر والے بہت خوش ہوئے۔ بہت تبدیلی آ چکی تھی میری بہن گلبانو کی شادی ۱۹۷۷ میں ہوئی تھی اور کچھ وجوہات کے سبب اسے طلاق ہو گئی تھی، اس کا ایک لڑکا فیصل اس وقت دو ماہ کا تھا۔ میری بہن یاسمین کی منگنی میرے ایک ہم جماعت دوست امین کامدار سے ہو چکی تھی۔ میں نے گھر والوں کو امریکہ والی لڑکی کے بارے میں قائل کرنے کی کافی

کوشش کی لیکن گھر والے کسی طرح سے تیار نہیں ہوئے۔ میری ماں نے مجھے بتایا کہ اس نے کئی جگہ میرے رشتے کی بات کی ہے لیکن ابھی تک کہیں سے کوئی جواب نہیں ایا۔ ادھر ابراہیم کرمالی نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میری اس لڑکی سے شادی نہ ہو سکی تو وہ میرے لیے بہتر لڑکی تلاش کریں گے۔ یہاں تو میں نا امید ہو چکا تھا۔

چھٹی کے دوران میں اپنے والد صاحب کے ساتھ ان کے کام پر چلا جاتا، کبھی کبھار زکریا موٹن مجھے اپنے کام کے سلسلے میں کسی نئی جگہ لے جاتے۔ زکریا بھائ نے اپنا ایکسپورٹ کنسلٹنگ کا بزنس شروع کیا ہوا تھا۔ ایک دفعہ جب میں اور والد صاحب کاٹھیا واڑ کی بس میں بیٹھ کر ادم جی نگر کی طرف جا رہے تھے تو انہوں نے ایک ایسی عجیب و غریب بات کا ذکر کیا جو میرے لیے نہایت ہی پریشان کن اور حیران کن تھی۔ انہوں نے بتایا ہے کہ جب میرا چھوٹا بھائی گزشتہ سال پاکستان آیا تھا تو اس نے میرے خلاف کافی منفی قسم کی باتیں کی تھیں اور یہ کہ وہ یہ باتیں سن کر بہت حیران اور مایوس بھی ہوئے۔

اس نے میرے والد کو کہا کہ میں امریکہ میں اپنا وقت برباد کر رہا ہوں، الفاظ کچھ یوں تھے کہ اسے دیکھو اب اس کے پاس گرین کارڈ ہے اور یہ پاکستان منگنی کرنے پہنچ گیا ہے۔ لیکن میرے والد اچھی طرح جانتے تھے کہ میں نے خاندان کہ کس طرح سے مدد کی ہے اور یہ بھی کہ کس طرح میں نے اپنی اسکول کی تعلیم کم سے کم وقت میں صرف سوا چار سال میں مکمل کر لی تھی۔ پاکستان سے میں صرف گیارہویں جماعت مکمل کر کے نکلا تھا اور آج اس تھوڑے سے عرصے میں میں نے اپنی

گریجویشن مکمل کرلی تھی۔ والد صاحب کو مجھ پر فخر تھا۔ اس واقعے سے میں نے یہ سبق سیکھا کہ چاہے آپ کے خاندان کے افراد ہوں یا رشتہ دار، اگر کوئی اپ کی تعلیم اور معیار زندگی سے حسد کرے تو اس پر کوئی توجہ دینے کی ضرورت نہیں آپ کو جو صحیح لگتا ہے آپ وہی کریں۔

ایک دن گھر پہ میری بہن کی ایک دوست جس کا نام رخسانہ تھا جو اس وقت امید سے تھی گھر پر آئی، وہ میری بہت عزت کرتی تھی، میں بھی اس کے رویے سے کافی متاثر تھا۔ میں نے اپنی بہن سے پوچھا کہ کیا اس کی کوئی بہن ہے، تو اس نے کہا ہاں۔ ہمارا ایک معمول تھا کہ جب بھی ہم کوئی خاص قسم کی بات چیت یا مشورہ کرنا چاہتے تو مومن صدیق کے گھر چلے جاتے۔ اسی سلسلے میں میں نے ماں کو مومن صدیق کے گھر پہنچنے کا کہا۔ آدھے گھنٹے بعد دوبارہ فون کیا تو پتہ چلا ماں مومن صدیق کے گھر پہنچ چکی ہیں۔ تھوڑی دیر میں میں بھی پہنچ گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ دو نوجوان لڑکیاں کمرے میں ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی ہیں، ساتھ ہی رخسانہ بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے کچھ دوستوں کو فون کرنا تھا، میں نے مومن بائی سے پوچھا کہ کیا میں فون استعمال کر سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا ضرور اور فون کی طرف اشارہ کیا جو کمرے ایک کونے میں رکھا ہوا تھا۔ یہ تینوں لڑکیاں فون کے مخالف سمت بیٹھی ہوئی تھی۔ جب میں اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا تو مجھے ان کی باتیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اس وقت مجھے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ موقع میری پوری زندگی بدل دے گا۔

جب میں فون سے فارغ ہوا تو مومن بائی نے میرا تعارف لڑکیوں سے کرایا، یہ ابراہیم شاو باوانی کی بیٹیاں تھیں، بڑی والی کا نام یاسمین اور چھوٹی والی کا نام فردوس تھا جو اپنی خالہ مومن بائی سے ملنے آئی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنا تعارف کرایا، خدا کا کرنا کچھ یوں ہوا کہ میں اتفاقاً یاسمین سے انگریزی میں بات کرنے لگا، اس نے بھی انگریزی میں مجھے جواب دینا شروع کر دیا، اس نے بتایا کہ اس کی پرورش ہندوستان میں ہوئی ہے اور اس نے سینٹ جوزاف کالج سے گریجویشن کیا ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ ملاقات اللہ کی طرف سے ایک نعمت غیر متقبہ ہے۔ اور اس بات کا بھی احساس ہوا کہ اس ملاقات کا اہتمام میری بہن اور مومن بائی نے کیا ہے تاکہ میں لڑکی پسند کر سکوں۔

یاسمین دوسری دیسی لڑکیوں سے کافی مختلف تھی۔ میں نے والدہ سے اشارتاً بات کرنے کے لیے کہا، وہ کہنے لگیں کہ مومن صدیق سے بات کر کے بتائیں گی تاکہ پہلے یہ تو پتہ چلے کہ لڑکی بھی کچھ دلچسپی رکھتی ہے یا نہیں۔ دوسرے دن میری ماں کو کچھ مثبت اشارات ملے تو انہوں نے میرا رشتہ ڈال دیا۔

یاسمین کے گھر والوں نے مجھ سے ملنے اور میرے کاغذات وغیرہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ایک دن طے ہوا کہ مومن صدیق کے گھر سب پہنچ جائیں۔ جب ہم ان کے گھر پہنچے تو یاسمین کی فیملی، اس کے بہنوئی عارف، مومن صدیق کا بیٹا، رخسانہ کا شوہر جو دوہا، قطر میں ملازمت کرتا تھا، یاسمین کے والد حاجی ابراہیم شاو، یاسمین کے تمام چاچا، زکریا شاو، رزاق شاو، سلام شاو، بشیر شاو، یونس شاو اور اقبال شاو پہلے سے موجود تھے۔

میرا ان سب سے تعارف کرایا گیا۔ زکریا شاو بات چیت میں اچھا اور بے تکلف شخص تھا۔ میری اس سے جلد ہی دوستی ہو گئی اور میری گھبراہٹ اور پریشانی بھی کچھ کم ہوئی۔ مجھ سے کافی پوچھ گچھ کی گئی، ایک طرح سے میرا باقاعدہ انٹرویو لیا گیا، میں نے اپنے پرس میں سے کاغذات، لایسنس اور کریڈٹ کارڈز وغیرہ نکال کر دکھائے۔ اس پر بھی سوال ہوا کہ میرے پاس گرین کارڈ جمع ہونے کی صرف درخواست کیوں ہے، اصلی گرین کارڈ کیوں نہیں؟ پھر مجھ سے ایک دن کے لیے میرا پرس رکھنے کی استدعا کی گئی، میں نے اپنا پرس انکے حوالے کر دیا۔ ماحول کافی خوشگوار رہا۔ جہاں تک میرا خیال ہے میں نے اپنی امکانی حد تک تمام سوالات کے جواب احسن طریقے سے دیے تھے۔

دوسرے دن میرا پرس واپس آگیا بغیر کسی سوال یا جواب کے۔ میری والدہ کو کچھ پریشانی سی ہوئی اور وہ جواب مانگنے بھاگی بھاگی مومن صدیق کے گھر پہنچ گئیں۔ گھر آتے ہی انہوں نے خوشخبری سنائی کہ یاسمین کے والد سنجیدگی سے ہماری منگنی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ ایک بار پھر مجھے زندگی حسین لگنے لگی۔ اسی دوران میری بہن یاسمین کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی، لیکن میری چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں، میرے لیے شادی تک رکنا بہت مشکل تھا۔

کچھ ہی دنوں میں یاسمین کے گھر والوں کی طرف سے بلاوا آگیا کہ ہم چند خاندان کے لوگوں اور کچھ دوستوں کو لے کر انکے گھر آجائیں تاکہ بات چیت طے پا سکے۔ یہ ہمارے خاندان کی ایک رسم ہے کہ جب رشتہ طے کرنا ہو تو لڑکی والے لڑکے والوں کو اپنے گھر "ہاں" کہنے کے لیے بلاتے ہیں۔ ادھر

میرا بھائی منور بھی ابھی تک کراچی میں تھا اور اپنی ہائی اسکول کی پیاری ساتھی رحیمہ سے شادی کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ رحیمہ میرے کزن بھائی زکریا موٹن کی بیٹی تھی۔

مقررہ دن پر میں، میری والدہ، تمام بہنیں، میری ایک کزن زبیدہ موٹن، اور بھائی منور، رشتہ طے کرنے کے لیے یاسمین کے گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔ میں نے حاجی اقبال سے گاڑی مانگ لی تھی جسے میں ہیوسٹن سے جانتا تھا جو اب کراچی میں مقیم تھا۔ گھر جمشید روڈ پر واقع تھا جس کا نام پہلے افریقہ ہائوس ہوا کرتا تھا، بعد میں اسے محمد شاو باوانی نے خرید کر اسکا نام باوانی ہائوس رکھ دیا۔ جب ہم گھر پہنچے تو وہاں بہت سے لوگ پہلے سے ہی ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے، آہستہ آہستہ اور لوگ بھی آنے لگے۔ ہمیں جس کمرے میں رسم ہونا تھی وہاں بٹھا دیا گیا، تھوڑی ہی دیر میں یاسمین ایک نہایت خوبصورت لباس پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی، مجھے لگا جیسے میرے خوابوں کی شہزادی اندر داخل ہو رہی ہے، ایمانداری سے کہوں تو مجھے یاسمین سے پہلی نظر میں ہی محبت ہو گئی تھی۔ وہ میرے برابر آکر بیٹھ گئی، ہمیں چینی، پستے، دودھ، اور بادام ملا ہوا ایک گلاس دودھ پینے کے لیے دیا گیا، پھر پھولوں کے ہار کا تبادہ ہوا اور رسم پوری ہوئی۔ میں اپنے ساتھ انسٹنٹ پکچر کیمرہ اور کئی رولز لے گیا تھا، منور تصویریں اتار رہا تھا۔ لوگوں نے اسے بہت پسند کیا کیونکہ تصویر لینے کے چند منٹوں بعد ہی آپ اسے دیکھ سکتے تھے۔ میں نے معذرت کے ساتھ یاسمین کی ماں سے اسے دو گھنٹے کے لیے باہر لے جانے کی اجازت مانگی، تھوڑی سی مزاحمت کے بعد وہ راضی ہو گئیں اور ہم چلے گئے۔

دونوں خاندانوں نے طے کیا کے اب جب رشتہ طے ہو ہی چکا ہے تو کیوں نہ منگنی کر لی جائے، طے ہوا کے منگنی کی رسم ہمارے گھر پر ہو گی۔ ہم نے منگنی کی تقریب کے لیے اپنے گھر کی چھت کا انتخاب کیا، گو چھت کچھ چھوٹی تھی لیکن زیادہ لوگوں کو بلانا بھی نہیں تھا۔ اس چھوٹی سی تقریب کے لیے ہمیں کافی محنت کرنا پڑی۔ میرے والد کے ایک دوست یوسف لاکھانی کا ٹینٹ ہائوس تھا، کاٹھیاواڑ میمن ٹینٹ ہائوس کے نام سے، میں نے ان سے ضروری سامان کرائے پر لے لیا، یہ اتنا تیز بولتے تھے کے بعض اوقات انہیں سمجھنا مشکل ہو جاتا تھا، بہت شریف النفس انسان تھے اور ہمیشہ ہمارا بہت احترام کرتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے کئی بیٹے امریکہ میں ہیں۔ ان میں سے ایک بیٹا ہاشم لاکھانی ہیوسٹن میں نہایت معروف بزنس مین بن گیا تھا۔ میں نے یاسمین سے فون پر بات چیت کر کے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ ہم کس قسم کے کپڑے پہنیں گے۔ یوسف بھائی نے تمام سامان وقت پر بہنچا دیا، ہم لوگوں نے مل کر ٹینٹ، کرسیاں، میزیں اور قالین وغیرہ سیٹ کر دیے، تقریب اچھی رہی، اس کے دوران ہم نے ایک دوسرے کو انگوٹھیاں پہنائیں اوریوں ہماری منگنی کی رسم ادا ہو گئی۔

میرے جانے میں تھوڑے دن رہ گئے تھے، میں اور یاسمین زوزآنہ فون پر بات چیت کرتے، کبھی شام کو مل بھی لیتے، شادی کی تقریب اور ہیوسٹن جانے کی منصوبہ بندی کرتے، ساتھ رہنے کے عہد و پیماں کرتے، ہم ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ شاید ہر خاندان میں کچھ لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کو خوش نہیں دیکھ سکتے، میرے خاندان میں بھی کچھ لوگ ایسے ہی تھے جو ہماری منگنی سے خوش نہیں تھے، انکی جلن و حسد پر بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے یاسمین سے وعدہ

کیا کہ میں اسکے لیے اسٹوڈنٹ ویزا کی درخواست جمع کرا دوں گا تا کہ شادی ہوتے ہی ہم ایک ساتھ ہیوسٹن روانہ ہو سکیں۔

میں بوجھل دل کے ساتھ امریکہ واپس آیا۔ آتے ہی میں نے یونیورسٹی آف ہیوسٹن ڈاون ٹاؤن کالج میں یاسمین کے داخلے کی اور غیر ملکی زبان انگریزی کا ٹیسٹ دینے کی درخواست بھر دی۔ یاسمین نے ٹیسٹ بہت اچھے نمبروں سے پاس کر کے سب کو حیران کر دیا۔ ٹیسٹ پاس کرنے کے بعد اس نے اسٹوڈنٹ ویزا کے لیے اپلائی کر دیا۔ مجھے حیرت نہیں ہوئی اس لیے کہ یاسمین نے ہندوستان کے مشہور کالج سینٹ جوزف سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ انگریزی، فرانسیسی، ہندی اور اردو جانتی تھی۔ امریکی سفارت خانے میں اسکا انٹرویو میامی یونیورسٹی کی ڈین ڈاکٹر تھاور نے لیا، انٹرویو کے دوران انہوں نے یاسمین کو بتایا کہ وہ اس کا مضمون اپنے طالب علموں کو دکھائیں گی۔ انہوں نے اس کامیابی پر یاسمین کو مبارکباد دی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

ان باتوں میں نے جو چیز سیکھی وہ یہ کہ انسان کو صرف اس چیز پر توجہ رکھنی چاہیے جسے وہ صحیح سمجھتا ہو بجائے دوسروں پر دھیان دینے کے جن کا اس کی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں۔

میری بہن یاسمین اور امین کی عمروں میں فرق کے باوجود اس کی شادی امین عبداللہ سے ہو گئی۔

کچھ ہی دنوں میں میری منگیتر یاسمین نے مجھے اپنی زندگی کی بہترین خبر کے ساتھ فون کیا کہ اسے چار سال کا اسٹوڈنٹ ویزا مل گیا ہے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

نومبر ۱۹۷۹ میں میں ایک بار پھر پاکستان کے لیے روانہ ہوا، میری شادی کی تاریخ ۱۷ نومبر طے ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں جیت پور میمن اسوسیشن نے ڈنر پارٹیوں پر پابندی لگائی ہوئی تھی، اور سچ بات تو یہ ہے کہ میں کوئی بڑا خرچہ برداشت کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ یاسمین نے میرا پورا پورا ساتھ دیا۔

نکاح کی تقریب میمن مسجد بولٹن مارکیٹ میں عصر کی نماز کے بعد ہونا تھی۔ حاجی اقبال ہمیں لے کر مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ میرے ماموں مجید کے پاس تمام کاغذات پہلے سے تیار تھے۔ عصر کی نماز کے بعد مولوی صاحب نے مجھے آگے بلا کر بٹھا لیا ساتھ میں گواہان کو بھی آنے کا کہا۔ گواہان میں میری طرف سے میرے محبوب مجید اور چچا عثمان اور خواتین کی طرف سے زکریا شاؤ باوانی اور یاسمین کے والد ابراہیم شاؤ باوانی تھے۔ امام صاحب نے نکاح سے متعلق قران کی چند آیات تلاوت کیں اور اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کی بھی وضاحت کی۔ اس کے بعد مجھ سے تین بار پوچھا کہ کیا عقد نگاہ قبول ہے، جس پر میں نے جواب دیا کہ جی قبول ہے۔ اس کے ساتھ ہی نکاح مکمل ہو گیا، اچھی اور خوشگوار ازدواجی زندگی کی دعائیں مانگی گئیں، دعا کے بعد لوگوں نے آپس میں مصافحہ کیا گلے ملے اور مبارک بادیں دیں۔

میرے بہترین دوستوں میں سے حاجی اقبال اور رزاق باوانی ،راجہ ستار باوانی پریس والے کے بیٹے میرے ساتھ ساتھ تھے، میرے ایک اور نہایت عزیز دوست فاروق ولی نے رضاکارانہ طور پر تصاویر

کھینچیں۔ ظاہر ہے کہ مرحوم فاروق ولی ہر تصویر میں غائب تھا، میں اس کا قرض کبھی نہیں چکا سکوں گا، نہایت ہی شاندار انسان تھا، اللہ تعالی اس کی مغفرت کرے۔

زندگی کے اس بندھن کے بارے میں میرے ملے جلے جذبات تھے۔ ایک طرف احساس ذمہ داری تھا تو دوسری طرف زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد۔ میں خوش تھا کہ میری شادی ایک ایسی لڑکی سے ہوئی ہے جسے میں دل و جان سے پسند کرتا تھا۔ نکاح کے بعد ہم دونوں فیملیز کاٹھیا واڑ ہال کی طرف روانہ ہو گئے جہاں خاص طور پر خواتین کے لیے کچھ آئسکریم کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

نکاح کے تین دن بعد ہی ہم ہیوسٹن جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ یاسمین اپنے خاندان کو چھوڑنے پر کچھ افسردہ اور رنجیدہ تھی۔ ہمیں کراچی سے نیویارک اور پھر نیویارک سے ہیوسٹن کی فلائٹ لینی تھی۔ نیویارک پہنچ کر جب ہم امیگریشن اور کسٹم سے فارغ ہوئے کے بعد ڈیلٹا ایئر لائن کے کاؤنٹر پر ہیوسٹن جانے کا بورڈنگ پاس لینے پہنچے تو کسی نے میرے کاندھے پر تھپکی دی، جیسے ہی میں پیچھے مڑا ایک کسٹم افیسر نے اپنا بیج مجھے دکھا کر کہا کہ میں اپنا سامان لے کر اس کے ساتھ چلوں۔ اسے شاید کوئی شک ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور کسٹم افیسر بھی تھا دونوں مجھے ایک کمرے میں لے گئے اور میرا تمام سامان چیک کیا، تمام جیبیں بھی خالی کروائیں، لیکن میرے پاس سے ایسا کچھ نہ نکلا جو میں نے فارم پہ ڈیکلیئر نہ کیا ہو۔ انہوں نے مجھے صرف اتنا کہا کہ آپ جا سکتے ہیں۔

میں نے فورا ہی اپنا سامان اٹھایا اور تیزی ڈیپارچر لاؤنج کی طرف جانے والی لفٹ کی طرف روانہ ہو گیا جہاں میں نے یاسمین کو قریب چھوڑا تھا۔ تھوڑی دیر میں یاسمین مجھے نظر آ گئی اور ہم دونوں ڈیلٹا

ایئرلائن کی ہیوسٹن جانے والی پرواز کے گیٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب ہم لائن میں کھڑے ہوئے تو میں نے یاسمین کو سارا قصہ سنایا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

ہیوسٹن ایئرپورٹ پر میرا بھائی اشرف، چند دوست اور ابراہیم کرمالی اور ان کی بیوی خالہ زہرہ اپنے بیٹے کے ساتھ استقبال کے لیے موجود تھے۔ ہمارے لیے ایک اچھی گاڑی کا انتظام کیا گیا تھا جس میں بیٹھ کر ہم گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچنے پر خالہ زہرہ نے نئی دلہن کے گھر میں داخل ہونے والی کچھ روایتی رسومات ادا کیں۔ ہم دونوں لمبی فلائٹ کی وجہ سے کافی تھکے چکے تھے اس لیے جلدی سونے چلے گئے۔ اگلے دن میری چھٹی تھی، میرے پاس یاسمین کو بتانے اور سمجھانے کے لیے بہت سی باتیں تھیں۔ میں اپنے بھائی اشرف اور اپنے دوستوں میں حاجی اقبال اور ہارون کا بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے میری بیوی کو سیٹل ہونے میں بہت مدد کی۔

واپس آنے کے ایک ہفتے بعد ہی مجھے میرے ڈیٹا پروسیسنگ مینجر ڈیوڈ ورمن کی کال آئی۔ انہوں نے مجھے کارپوریٹ افس میں کمپیوٹر لینگویج ارپی جی پروگرامر کے طور پر جاب کی پیشکش کی، سالانہ تنخواہ ۱۸۵۰۰ ڈالر تھی۔ میں نے بخوشی اسے قبول کیا اور مقررہ تاریخ سے کام شروع کر دیا۔

میرے باس ڈیوڈ ورمن کے پاس بھی میری طرح قدرتی سائنسز اور ریاضی میں بیچلرز کی ڈگری تھی۔ وہ میری کافی عزت کرتا تھا۔ اس نے مجھے ڈیٹا پروسیسنگ کے تمام انس اینڈ اؤٹ سکھائے۔ ہمارے دفاتر کمپیوٹر روم کے بالکل باہر ہوا کرتے تھے۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں ڈیٹا پروسیسنگ مینجر ڈیوڈ ورمن، اپریشنز منیجر گرے، دو کمپیوٹر آپریٹرز اور میں، ایک کمپیوٹر پروگرامر شامل تھے۔

اس سال میں نے کئی مین فریم ہارڈوئر کورسز میں شرکت کی، ساتھ ہی سین فرانسسکو کیلیفورنیا کے قریب اوکلینڈ میں اپنے ہیڈ کوارٹرز کا دورہ کیا۔ میری تربیت کے چھ ماہ کے اندر ہی ہمیں پرانے سسٹم کو نئے سسٹم میں تبدیل کرنے کا ایک بہت بڑا پروجیکٹ دے دیا گیا۔ میری ذمہ داریوں میں تمام مقامی انتظامات اور پے رول کو کمپیوٹرائز کرنا تھا۔ باقی سسٹم جیسے خریداری اور انوائس مینجمنٹ سسٹم وغیرہ ہیڈ کوارٹر سے کنٹرول ہونے تھے۔ ہمیں انسٹال کرنے اور چیک کرنے کے لیے ٹیپس بھیجا جایا کرتی تھیں۔ ڈیٹا پروسیسنگ ڈیپارٹمنٹ کا انتظام سنبھالتے ہی میں نے بہتر جاب کے لیے اپنا رزیومے بھیجنا شروع کر دیا۔

اسی دوران یاسمین کا ڈاکٹر کے پاس جانا ہوا تو پتہ چلا کہ وہ امید سے ہے، میرے لیے یہ ایک نہایت ہی حیرت انگیز اور خوشی کی خبر تھی۔ میں نے فورا ہی اپنے گھر والوں کو یہ خوشخبری سنائی۔ منور گھر سے جا چکا تھا اور دوسرے بھائی گھر بیچ کر اپنا حصہ مانگ رہے تھے تاکہ وہ الگ ہو سکیں۔ میں نے والد صاحب کو صورتحال سے آگاہ کیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ گھر بیچ دینا اچھا ہے اس لیے کہ شادی کے لیے جو رقم ادھار لی گئی تھی وہ بھی ادا ہو جائے گی اور تم بھائیوں کو ان کا حصہ بھی دے سکو گے۔

میں نے اپنے والد کی ہدایت کے مطابق عمل کیا اور یاسمین کو لے کر ایک لیز والے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گیا۔ یہ مینگم کے قریب وٹوگا روڈ پر لامونٹے پارک کے نام سے بالکل نئے بنے تھے جو ہماری پرانی رہائش سے زیادہ دور نہیں تھے۔ یہاں ڈیلس سے میرا ایک دوست یوسف اپنی بیوی اور چھوٹے

بچے کے ساتھ کافی آیا جایا کرتا تھا۔ ہم چائنا پیلس ریسٹورنٹ ایک خاص قسم کی مچھلی کھانے جایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ جب ہم گھر واپس پہنچے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے تو یاسمین کے پیٹ میں درد شروع ہو گیا، وہ اپنے آٹھویں مہینے میں تھی۔ جب اس کی گائنکالوجسٹ کو فون کیا تو اس نے فورا ہسپتال پہنچنے کا کہا۔ ہم یوسف کی گاڑی میں بیٹھ کر ہسپتال کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں یوسف کی بیوی نصرت، یاسمین کو تسلیاں دئیے جا رہی تھی۔ میں پچھلی سیٹ پہ یاسمین کے ساتھ بیٹھا تھا اور چاہ رہا تھا کہ کسی طرح جلدی سے ہسپتال پہنچ جائیں۔ نارتھ ویسٹ ہیوسٹن مینگم سے ہسپتال تک ایک لمبی ڈرائیو تھی۔ ہسپتال پہنچنے پر یاسمین کو فورا ایمرجنسی میں لے جایا گیا، لیکن چیک کرنے پر پتہ چلا کہ ابھی ایسی کوئی بات نہیں یہ ایک فالس الارم تھا جو بعض دفعہ پیٹ میں بچوں کے ہاتھ پاؤں چلانے کی وجہ سے بھی ہو جاتا ہے۔

یاسمین کی مقررہ تاریخ ۲۵ دسمبر تھی، ڈاکٹر نے ۲۶ تاریخ کو سی سیکشن شیڈول کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے بچے کے نام پہلے سے سوچ کر رکھے تھے کہ اگر لڑکی ہوگی تو شرمین اور اگر لڑکا ہوگا تو نعمان۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۰ کو اللہ تعالی نے ہمیں نہایت ہی خوبصورت بیٹی سے نوازا جس کا نام ہم پہلے ہی طے کر چکے تھے۔

نیا سال شروع ہونے پر میری تنخواہ میں بھی کچھ اضافہ ہو گیا جو ایک فرد کے اضافے کی وجہ سے ایک خوش ائند بات تھی۔ اس دوران میرے ایک بہترین دوست رفیق لویہ اور عائشہ لویہ نے ہماری بہت مدد کی، غیر شادی شدہ دوستوں میں ہمیں زکریا اور مسعود ہارون محترم نے بھی کافی ساتھ دیا۔

ہم لوگوں نے نئے گھر کی تلاش شروع کر دی، کیٹی ایک اچھا علاقہ تھا، یہاں بارکر سائپرس کے قریب سلور مل سب ڈویژن میں کچھ نئے ٹاؤن ہاؤسز بن رہے تھے، مکان خوبصورت اور کافی بڑے تھے، ہم دونوں کو بہت پسند آئے۔ نئے گھر کی قیمت تقریبا ۵۴ ہزار ڈالر تھی۔ اس زمانے میں انٹرسٹ ریٹ بھی ۱۴ سے ۱۶ پرسنٹ کے قریب چل رہا تھا۔ ٹیکس اور انشورنس ملا کر میری قسطیں ۷۵۰ ڈالر ماہانہ بنتی تھیں میری امدنی کا ۵۰ فیصد۔

میں نے شام کو سیلز پرسن کے طور پر دوسری نوکری کرنے کا فیصلہ کیا، مجھے ویسٹ اوکس مال پر واقعہ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور، "فولیز" میں جاب مل گئی۔ دو مہینے بعد ہی مجھے الیکٹرانکس ڈیپارٹمنٹ میں ٹرانسفر کر دیا گیا، جہاں میں الیکٹرانکس کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر وغیرہ بھی بیچتا تھا۔ فولیز مجھے کمیشن کے ساتھ ساتھ ۲۰ گھنٹے کام کرنے کی تنخواہ بھی دے رہا تھا۔ تقریبا ڈیڑھ سال وہاں کام کرنے کے بعد میں کافی تھک چکا تھا۔

اسی دوران ۱۰ جون ۱۹۸۳ کو ہمارے ہاں ایک اور فرد کا اضافہ ہو گیا، ہمارے بیٹے نعمان کا۔ بیٹے کا سن کر میرے خاندان والے کافی حیران ہوئے ان کا خیال تھا کہ شاید اس دفعہ بھی بیٹی ہوگی۔ ہم تو

بیٹی ہونے پر بھی بہت خوش تھے، شرین تو ہماری انکھ کا تارہ تھی۔ بیٹے کے ہونے سے ہماری خوشیاں اور بھی دوبالا ہو گئیں۔

میرے لیے دو جاب کرنا مشکل ہو رہا تھا اس لیے میں نے دوسری کمپنیوں کے ڈیٹا پروسیسنگ ڈیپارٹمنٹ میں نوکری تلاش کرنے کے سلسلے میں درخواستیں دینا شروع کر دیں۔ کریڈٹ بیورو اف گریٹر ہیوسٹن کو آن لائن سسٹم کے لیے اسمبلر پروگرامر کی ضرورت تھی، انہوں نے مجھے انٹرویو کے لیے بلا لیا، انٹرویو کافی سخت تھا لیکن اللہ کا کرم ہوا اور مجھے جاب کی آفر ہو گئی۔ تنخواہ بھی اچھی تھی، مجھے دوسری نوکری کی ضرورت بھی نہیں تھی اور میں اپنا اور اپنے والدین کا خرچہ اسانی سے اٹھا سکتا تھا۔ اس نوکری کی وجہ سے ہمارے مالی معاملات بہتر ہونا شروع ہو گئے۔

نعمان کے آنے سے ہماری زندگی میں اور تبدیلیاں آنی شروع ہو گئیں۔ تین افراد کی جگہ اب ہم چار تھے۔ شروع شروع میں شرین نعمان کے آنے سے کچھ خوش نہ تھی، لیکن اہستہ اہستہ اسے اپنے بھائی کی عادت پڑ گئی۔ یہاں یہ بات بتاتا چلوں کہ ہم نے ہمیشہ اچھے اور برے وقت میں اللہ پر بھروسہ کیا، ہمارا ایمان اور یقین ہے کہ اللہ تعالی ہی روزی کے راستے اور اسباب مہیا کرتا ہے، وہ آپ کے وسائل کو آپ کی ذمہ داریوں کے تناسب سے اسباب مہیا کرتا ہے۔ مجھے اپنی بیوی پر فخر ہے جس نے کبھی بھی شکایت نہ کی اور نہ ہی مجھے اپنے والدین کو پیسے بھیجنے سے روکا۔ درحقیقت اسی نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی زندگی میں ایک نظم و ضبت پیدا کروں۔ میں نے اپنے والدین کو ہر مہینے باقاعدگی سے پیسے بھیجتا تھا۔ جب آاپ اپنے والدین پر خرچ کرتے ہیں تو اللہ تعالی اپ کے مال میں

اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپ کو صحت وتندرستی بھی عطا کرتا ہے۔ صدقہ گھر سے ہی شروع ہوتا ہے۔

یاسمین اور بچے فیملی کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لیے پاکستان روانہ ہو گئے۔ یاسمین نہایت با ہمت اور حوصلے والی خاتون ہے، دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پاکستان کے سفر پر لے جانا کوئی اسان کام نہ تھا۔ مجھے اندازہ ہے کہ ایک بچے کو بھی سنبھالنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے پاکستان پہنچنے پر میری ماں اور میری بڑی بہن نے نہایت کوتاہ نظری کا مظاہرہ کیا۔ میری ماں توقع کر رہی تھی کہ بہو ان کے گھر پر رہے گی اور روزمرہ کے کام کاج میں ان کا عام بہوؤں کی طرح ہاتھ بٹائے گی۔ لیکن یاسمین صرف چند ہفتوں کے لیے اپنے والدین سے ملنے گئی تھی۔ اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ اس طرح سے ان کی توقعات پر پورا اتر سکے۔ میرے بھائیوں نے بھی کافی باتیں بنائی خاص طور پر ایک بھائی نے تو ان باتوں کو کافی اچھالا جس سے اور بھی بدمزگی پیدا ہو گئی۔

میں چاہتا ہوں کہ آنے والی نسلیں ان باتوں سے کچھ سبق حاصل کریں۔ ہمارے معاشرے میں بہوؤں کے ساتھ نہایت ناروا رویہ رکھا جاتا ہے ، اور ایک عجیب دہرا معیار ہے۔ اپنی بیٹی کا شوہر اگر بیٹی کا خیال رکھے تو اسے بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ لیکن جب بیٹا اپنی بیوی کا خیال کرے تو اسے مختلف القابات سے نوازنے لگتے ہیں مثلا جورو کا غلام، بیوی سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتا، بہو نے تو جادو کر دیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی سوچ ہمارے ہندوانہ پس منظر یا معاشرے سے آئی ہے جو کہ ایک نہایت ہی غلط سوچ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی بہوؤں کا بھی بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح

سے خیال رکھا کریں، یہ بیچاریاں اپنے گھر بار چھوڑ کر ایک مکمل اجنبی کے ساتھ ہمیشہ کی زندگی گزارنے آتی ہیں۔ ساس سسر کی خدمت کرنا ان کے فرائض میں شامل نہیں۔

ایک دن سیف وے میں کام کے دوران مجھے ہیوسٹن کے ایک ڈائمنڈ ، ایک بات اور مجھے یاد آگئی جیولرز اسٹور سے کال موصول ہوئی، یہ کال اسٹور سے منسلک ایک سکیورٹی تفتیشی افسر کی تھی، جو مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے دفتر بلا لیا، اس نے مجھے کچھ ڈاکیومینٹس دکھائے جس میں کسی نے امریکن ایکسپریس کارڈ پر کچھ ہیرے کی انگوٹھیاں خریدی تھیں - اس نے مجھے مورد الزام ٹھیرانا شروع کر دیا، اسکا رویہ کچھ جارحانہ تھا کہنے لگا کے ہم نے اس شخص سے فون پر تمہارے بارے میں پوچھ گچھ کی ہے، اس نے تمہارے کردار کے بارے میں کچھ اچھی باتیں نہیں کیں۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ کمپنی کے پاس سی سی ٹی وی کی تصاویر موجود تھیں، انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ صرف تصدیق کرنا چاہتے ہیں کے یہ تصاویر میری ہیں یا کسی اور کی۔ اسی درمیان ایک پولیس افسر بھی میری غیر موجودگی میں ہمارے گھر آیا، میری بیوی نے اسے بتایا کہ وہ جس کی تلاش میں ہیں وہ یہاں نہیں رہتا - تصاویر سے پتہ چلا کے وہ میری نہیں تھیں، بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ حرکت میرے خاندان ہی میں سے ایک شخص نے کی تھی، جسکا مجھے بہت افسوس بھی ہوا۔ مجھے ایک بار پھر سبق ملا کہ آپ کو ہمیشہ خاندان میں کچھ ایسے لوگ ضرور ملیں گے جو اپ کے مقام، تعلیم یا معیار زندگی سے جلن اور حسد رکھیں گے۔ ایسے لوگوں سے دور رہیں اور ان کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دیں۔ آپ اگر حق حلال کی کمائی کر رہے ہیں تو اپ کو اس سے فائدہ اٹھانے کا پورا حق ہے لیکن ساتھ میں دوسروں کا حق بھی ادا کرتے رہنا چاہیے۔

کریڈٹ بیورو میں میری ملازمت کو ابھی صرف تین ماہ ہوئے تھے کہ مجھے نیشول، ٹینیسی میں ہاسپٹل کارپوریشنز آف امریکہ کے جوائے ریچرڈسن کی کال موصول ہوئی۔ کسی زمانے میں میں نے کنگ فیصل ہسپتال اور ریسرچ سینٹر میں پروجیکٹ لیڈر کے عہدے کے لیے درخواست دی تھی جو میں بھول چکا تھا۔ یہ کال میرے لیے ایک نعمت غیر متوقع تھی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مجھے سعودی عرب جیسی جگہ پر ملازمت کرنے کا موقع ملے گا۔ لیکن میری ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میں اپنے بچوں کی پرورش کسی اچھے اسلامی ماحول میں کروں جہاں وہ بغیر کسی ڈر و خوف کے آزادی سے اپنے مذہب پر عمل کر سکیں، مساجد میں نماز ادا کر سکیں اور ہماری مقدس کتاب قرآن سیکھ سکیں۔

باب ۷

۱۹۸۵-۱۹۹۸

ایچ سی اے نے فون پر میرا انٹرویو کیا اور دو دن بعد مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ ویک اینڈ پر نیشوِل آسکتا ہوں۔ میں نے حامی بھر لی اور جمعہ کو اپنے خاندان کو ساتھ لے کر انٹرویو کے لیے نیشوِل روانہ ہو گیا۔ یہ دورہ ایک دو روزہ کریش کورس ثابت ہوا جس میں مجھے سعودیہ اور میری پوزیشن کے بارے میں مختلف معلومات فراہم کی گئیں۔ ہمیں عربی کے کچھ الفاظ بھی سکھائے گئے مثلا انشاءاللہ، مطلب اگر اللہ نے چاہا تو، بکرا جس کا مطلب کل یا اگلے دن اور مالش جس کا مطلب ہے کوئی بات نہیں وغیرہ۔

جیسے ہی مجھے معاہدے کی کاپی ملی تو مجھے اپنی تنخواہ اور مراعات دیکھ کر نہایت خوشی اور شادمانی محسوس ہوئی، میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ تنخواہ نہایت پرکشش تھی، رہائش بجلی پانی اور دیگر سہولیات بالکل مفت، بچوں کی تعلیم نجی امریکی اسکولوں میں، پورے خاندان کو سال میں ایک بار ہیوسٹن جانے کا کرایہ کمپنی کے ذمہ۔ اس کے علاوہ مجھے امریکہ میں ہر سال اپنی پسند کی ایک کانفرنس میں

شرکت کے لیے ٹکٹ ۔ سالانہ ۴۵ دن کی تنخواہ کے ساتھ چھٹی، حج کے دوران ۱۰ دن کی چھٹی اور رمضان میں سات دن کی۔

نیشول سے واپس اکرپیر کو میں نے اپنے باس کو مطلع کیا کہ مجھے نہایت اچھی شرائط کے ساتھ ایک نئی جاب مل گئی ہے اور دو ہفتوں میں میں نوکری سے رخصت لے لوں گا۔ یہ مارچ ۱۹۸۵ کا اختتام تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ویزوں کے اجرا میں کتنا وقت لگے گا یا ہمیں سعودی عرب جانے کے لیے اور کیا ضروریات پورا کرنا ہوں گی۔ دو ہفتوں بعد مجھے نیشول سے کال موصول ہوئی کہ میرا فیملی ویزا مسترد کر دیا گیا ہے اور ہسپتال کو دوبارہ درخواست دینا ہوگی۔ چند ہفتوں بعد ویزہ دوبارہ مسترد کر دیا گیا۔ اس بار ہسپتال نے مجھے تجویز دی کہ وہ صرف میرا ویزا اپلائی کر دیتے ہیں جو آسانی سے مل جائے گا اور یہ کہ میں ملازمت اختیار کر لوں اور عارضی طور پر اپنے خاندان کو چھوڑ کر سعودی عرب آ جاؤں، جیسے ہی فیملی کو ویزہ ملے گا کمپنی انہیں بلا لے گی۔ لیکن مجھے یہ منظور نہ تھا، مجھے اس تجویز سے انکار کرنا پڑا۔ اس پر انہوں نے مجھے مختلف تجاویز دیں کہ میں چاہوں تو ہیوسٹن میں ہی کوئی اور نوکری تلاش کر لوں، میرے لیے یہ بھی قابل قبول نہ تھا۔

میں نے اپنے گھر کی قسط کی ادائیگی بھی اس امید پر چھوڑ دی تھی کہ ہم تو سعودیہ روانہ ہو جائیں گے قسط بھرنے کا کیا فائدہ۔ ہاؤسنگ مارکیٹ اس وقت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ اگر میں گھر بیچنے کی کوشش کرتا تو مجھے شاید ۵۰ فیصد نقصان اٹھانا پڑ جاتا۔ قسط ادا نہ کرنے کی وجہ سے بینک نے ہمیں گھر خالی کرنے پر مجبور کر دیا۔ دو ہفتے کے بعد ہم کرکوڈ روڈ پر کرائے کہ ایک فرنشڈ اپارٹمنٹ میں منتقل ہو

گئے۔ گھر چھوڑ کر اپارٹمنٹ کمپلیکس میں رہنا بچوں کے لیے ایک بالکل مختلف تجربہ تھا۔ یہاں سوئمنگ پول بھی تھا جہاں بچوں کو تیراکی کرنے میں بہت مزہ آتا۔ دو سالہ نعمان نے بھی تیرنا سیکھ لیا۔

میں برابر ہسپتال کے ساتھ رابطے میں تھا کیونکہ میرا ہیوسٹن میں اب مزید نوکری کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ ہم نے سوچا کہ بجائے بیکار بیٹھ کر پریشان ہونے کے کیوں نہ ہم بچوں کو لے کر آرلینڈو، ڈزنی لینڈ چلے جائیں۔ اشرف پہلے ہی آرلینڈو منتقل ہو چکا تھا۔ میں نے اشرف سے بات کی تو اس نے رضامندی کا اظہار کیا۔ ہم نے اپنا تمام سامان پیک کر کے رفیق لویہ کے گھر چھوڑ دیا۔ مجھے کافی امید تھی کہ اگلے دو تین ہفتے میں ہمیں ویزا مل جائے گا۔ آرلینڈو میں ہم اشرف کے گھر رکے۔ ہم ہر روز صبح ڈزنی ورلڈ چلے جاتے اور جب چل چل کر تھک جاتے تو واپس گھر روانہ ہو جاتے۔ نعمان اور اشرف کی بیٹی ندا بہت چھوٹی تھی، آرلینڈو کی گرمی کی وجہ سے نعمان اکثر بیمار ہو جایا کرتا تھا۔

پتہ نہیں کیسے ایچ سی اے کو خیال آیا کہ وہ ہمارے پورے خاندان کو کراچی بھیج دیں کیونکہ پاکستان میں میرے لیے فیملی کو چھوڑنا اسان ہو گا۔ انہوں نے تجویز دی کہ میں اپنی فیملی کو پاکستان چھوڑ کر ریاض آجاؤں، ایک دفعہ جب میں سعودی عرب پہنچ جاؤں گا تو فیملی کے لیے ویزہ لینا اسان ہو جائے گا۔ میں نے ان کی یہ تجویز قبول کر لی۔ انہوں نے میرا ویزہ نکلوا لیا اور پوری فیملی کو پاکستان تک کا ٹکٹ جبکہ میرا ٹکٹ ریاض تک کا بنوا کر بھیج دیا۔

ہم نے پیکنگ شروع کر دی ہمارے پاس تقریبا ۱۰ بکسے بنے۔ ہمارے ٹکٹ اور پاسپورٹ ڈاک کے ذریعے بھیجے گئے تھے جسے کمپنی کے ایک ادمی کو لے کر ہمیں ایئرپورٹ پر دینا تھا۔ میرے بھائی منور اور بھتیجے یعقوب موٹن نے ہمیں ایئرپورٹ تک پہنچایا جس کے لیے میں ان کا بہت شکر گزار ہوں۔ ایئرپورٹ پر منور نے کسی طرح کاؤنٹر پر موجود شخص کے ساتھ میرا تمام سامان چیک ان کرا دیا حالانکہ ایک ٹکٹ پر دو سوٹ کیس لے جانے کی اجازت تھی جبکہ ہمارے پاس ۱۰ تھے۔ اب ہمیں آفس سے آنے والے لڑکے کا انتظار تھا۔ ان دنوں موبائل فون تو ہوتے نہیں تھے لیکن میں پبلک فون کے ذریعے آفس سے مسلسل رابطے میں تھا۔ آخر کار لڑکا پہنچ گیا اور ہم سب ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے لیے روانہ ہو گئے۔

کراچی پہنچنے پر جب میرا سامان بیلٹ پر آیا تو ۱۰ سوٹ کیسز دیکھ کر کسٹم والوں کو شک پیدا ہو گیا، انہوں نے کئی بکسے کھول ڈالے اور ہماری کچھ کراکری نکال کر پھینک دی۔ پھر جب انہیں پتہ چلا کہ ہم ۱۳ سال بعد امریکہ سے کراچی ائے ہیں تو شاید انہیں کچھ رحم آگیا اور باقی سامان کھولے بغیر ہمیں جانے دیا۔

ہم آدم جی نگر اپنے والد کے گھر پہنچ گئے، اتنے عرصہ بعد مجھے اپنے خاندان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں نے والد صاحب کو صلاح دی کہ سامان میں اپنی ساس کے گھر رکھوا دیتا ہوں کیونکہ اتنے چھوٹے گھر میں سامان رکھنے سے جگہ نہیں بچے گی۔ والد صاحب اس بات پر راضی نہیں ہو رہے تھے میں نے بڑی مشکل سے انہیں سمجھایا اور تمام سامان اپنی ساس کے گھر منتقل کر دیا۔ تھوڑے ہی

دنوں میں ریاض کے لیے روانہ ہو گیا اور میری بیوی بچوں کے ساتھ اپنے میکے چلی گئی۔ ایک اور سبق: اپنی بیوی اور بچوں پر زبردستی نہ کریں، اور نہ ہی فرسودہ روایات و ثقافت کی پیروی کرتے ہوئے بیوی کو زبردستی سسرال میں رہنے پر مجبور کریں۔ انہیں اپنے فیصلے خود کرنے دیں۔

آخر کار میں خوبصورت اور نئے تعمیر شدہ ریاض کنگ خالد انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اترا جہاں ایک سعودی جس کا نام احمد تھا، مجھے لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ یہ مجھے لے کر کنگ فیصل اسپیشلسٹ ہسپتال اور ریسرچ سینٹر کے لیے روانہ ہو گیا۔

ہسپتال ایک بہت بڑے کمپاؤنڈ میں واقع تھا، مجھے ہسپتال کے بالکل سامنے میڈیکل سٹی ولج میں تین بیڈ روم کا ایک چھوٹا سا ٹاؤن ہاؤس تفویض کیا گیا۔ گھر دکھانے کے بعد اس نے مجھے بتایا کہ فرج میں کھانے پینے کا سامان رکھا ہے اگر مزید کچھ چاہیے تو تھوڑی دور ہی ایک گروسری سٹور ہے جہاں سے ضرورت کی چیزیں مل سکتی ہیں۔ بعد میں اس اسٹور کا نام العزیزیہ سپر مارکیٹ ہو گیا تھا۔

میں اس اسپتال، کمپاؤنڈ اور حیرت انگیز شہر سے بہت متاثر ہوا، ہر جگہ نئی شاہرائیں اور عمارتیں زیر تعمیر تھیں۔ یاسمین کو فون کرنے کے بعد میں نے اسٹور سے کچھ اور گروسری کی اور کھانا پکانے کے لیے تیار ہو گیا۔ یاسمین نے کچھ مصالحے اور چاول وغیرہ ساتھ کر دیے تھے، اسٹور سے میں نے قیمہ خرید لیا کیونکہ قیمہ بنانا نسبتاً آسان تھا۔ ایک دفعہ پھر سے اپنی بیچلر زندگی کی یاد تازہ ہونے لگی جب میں امریکہ میں خود سے کھانا بنایا کرتا تھا۔ قیمہ پکاتے وقت مجھے ایسا لگا کہ جیسے گوشت خراب ہو، لیکن بھوک بہت زور کی لگی تھی، میں نے ساتھ میں چاول بھی بنا لیے۔ کھاتے وقت گوشت کا ذائقہ کچھ عجیب اور

نمکین سا لگا۔ کھانے کا برتن دھونے کے بعد میں نے چیک کرنے کے لیے ردی کی ٹوکری میں پڑا گوشت کا خالی پیکٹ اٹھا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تو اونٹ کے گوشت کا قیمہ تھا۔ مجھے کچھ سکون ہوا کہ قیمہ خراب نہیں تھا بلکہ اونٹ کا گوشت ہونے کی وجہ سے اس کا مزہ نمکین تھا۔ یوں بھی میں نے اس میں کافی لال مرچ ڈال دی تھی جس کی وجہ سے اس کا مزہ کچھ بہتر ہو گیا تھا۔

میں کافی تھک چکا تھا، اگلی صبح جلدی کام پر بھی جانا تھا، میں سونے کے لیے لیٹ گیا، کچھ دیر مستقبل کے بارے میں خیالات آتے رہے لیکن تھوڑی ہی دیر میں مجھے نیند آگئی۔ صبح جلدی سے اٹھ کر فجر کی نماز پڑھی ناشتہ کیا اور کام پر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہسپتال جیسا پہلے کہا گھر کے سامنے ہی تھا۔ کمپاؤنڈ کراس کر کے ہسپتال تک جانے کے لیے زیر زمین راستے بنے ہوئے تھے۔ مجھے ان صاحب سے ملنا تھا جنہوں نے مجھے ہسپتال کا دورہ اور مختلف لوگوں سے میرا تعارف کرانا تھا۔ ان کا کمرہ مرکزی عمارت کی پہلی منزل پر سی ای او کے دفتر کے ساتھ ہی تھا۔

دورے کے دوران مجھے جن لوگوں سے بھی ملایا گیا وہ سب کے سب زیادہ تر امریکہ سے آئے ہوئے تھے۔ جیسے ہی انہیں پتہ چلتا کہ میں ہیوسٹن امریکہ سے ایا ہوں تو مجھ سے نہایت گرم جوشی سے ملتے۔ کوئی ادھا دن ہسپتال کا دورہ کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اسانی سے راستے تلاش کر سکتا ہوں۔ اخر میں مجھے کمپیوٹر اینڈ ہاسپٹل انفارمیشن سینٹر لے جایا گیا، یہ ہسپتال کے عقب میں ایک چھوٹی سی عمارت تھی، بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ عمارت ہسپتال کی تعمیر کے دوران سائٹ آفس کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ ہسپتال چونکہ صرف رائل فیملیز کے لیے ہے، شاہی خاندانوں کے لیے

ہے، اس لیے اس پر پیسہ بھی بے تحاشہ خرچ ہوا ہوگا اور امریکہ سے خاص ڈاکٹروں کو بلا کر مشورہ بھی لیا گیا ہوگا۔

جیسے ہی میں ڈیٹا پروسیسنگ مینجر، صلوا الجاسر، کے دفتر میں داخل ہوا تو خلاف توقع مجھے امریکی لباس پہنے ایک خوبصورت خاتون ملیں جو روانی سے انگریزی بولتی تھیں، میں توقع کر رہا تھا کہ شاید کوئی عام سی حجاب والی خاتون ہوں گی۔ تعارف وغیرہ کروانے کے بعد میں نے کام کے بارے میں دریافت کیا۔ مجھے میڈیکل ایپلیکیشن پروجیکٹ لیڈر کی پوزیشن پر رکھا گیا تھا۔ میرا کام ہسپتال کی داخلہ اور رجسٹریشن درخواستوں کو کمپیوٹرائزڈ کرنا تھا۔ اس کے لیے ہسپتال نے ایک اسکینر سسٹم خریدا تھا۔ انہوں نے میری کافی حوصلہ افزائی کی، اور بتایا کہ کام زیادہ مشکل نہیں۔ میں نے اس سے پہلے کبھی درخواستوں پر کام نہیں کیا تھا میرے لیے کافی کچھ سیکھنے کو تھا۔ صلوا الجاسر نے میری کافی مدد کی ہے جہاں کوئی مسئلہ اتا وہ میری رہنمائی کرتیں۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میری فیملی پاکستان میں ہے اور انہیں ابھی تک ویزہ نہیں ملا، تو انہوں نے مجھے شعبہ ایچ ار میں ایک صاحب کے بارے میں بتایا کہ جا کر ان سے مل لو۔ ان صاحب نے میرے خاندان کی ویزا درخواست بھرنے اور جمع کرانے میں کافی مدد کی۔ دو ہفتے کے اندر ہی میرے خاندان کا ویزہ لگ گیا۔ میں نے یاسمین کو فون کر کے خوشخبری سنائی۔ عید الاضحی میں پانچ چھ دن باقی تھے، یہ لوگ عید سے ایک دن پہلے سعودی عرب پہنچ گئے۔

بچوں کو جگہ بہت پسند ائی، ایسا لگتا تھا جیسے ہم نے کبھی امریکہ چھوڑا ہی نہیں، یہاں ٹینس کورٹ، سوئمنگ پول، جاگنگ ٹریک، ورزش کرنے کی جگہ اور ایک چھوٹا سا گروسری اسٹور کمپاؤنڈ کے اندر ہی

موجود تھے۔ غرض یہ کے بچوں کے کھیلنے کودنے کا تمام سامان مہیا تھا۔ ایک بات بتانا میں بھول گیا کہ کمیونٹی کے ایک بزرگ شخص ہمارے سعودی عرب جانے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو لوگ ویزے پر سعودی عرب جاتے ہیں وہاں ان کو مزدوری وغیرہ پر لگا دیا جاتا ہے اور پاکستان بھی جانے نہیں دیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں غلط ثابت ہوئیں۔ انہیں شاید اندازہ نہیں تھا کہ پڑھے لکھے لوگوں کی سعودی عرب میں کافی عزت ہے۔

مصروفیت شروع ہو گئی، بچوں کو بھی مختلف سرگرمیوں میں لگا دیا۔ اس وقت شرین کی عمر ساڑھے تین برس تھی اور نعمان کی دو سال۔ امریکن اسکول نے بتایا کہ وہ پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کو داخلہ نہیں دیتے۔ ہم نے شرین کو برطانوی سکول میں اور نعمان کو کمپاؤنڈ کے اندر نرسری اسکول میں داخل کروا دیا۔ جب ہم شرین کا داخلہ کروا کر واپس آ رہے تھے تو راستے میں ریت کا طوفان سا آیا، مجھے سگنل کی سرخ بتی نظر نہیں آئی اور میں اسے کراس کر گیا۔ ابھی تھوڑا آگے ہی گیا تھا کہ پولیس والے نے مجھے روک لیا، اور مجھ سے کہنے لگا کہ کیا آپ کو اندازہ ہے کہ آپ نے کیا کیا۔ میں نے جواب دیا کہ نہیں مجھے نہیں معلوم۔ اس نے کہا آپ سرخ بتی پہ روڈ کراس کر لی۔ جب اس نے دیکھا کہ میرے ساتھ بیوی بچے ہیں تو اس نے مجھے تنبیہ کرنے کے بعد جانے دیا۔ میں ایک دوست کی گاڑی چلا رہا تھا اور میرے پاس امریکن لائسنس تھا۔ جب میں نے یہ قصہ اپنے دوست کو سنایا تو وہ بہت حیران ہوا اس نے کہا کہ تم بہت خوش قسمت ہو کہ اس نے تنبیہ کر کے تمہیں چھوڑ دیا ورنہ کاغذات نہ ہونے کی صورت میں تم ابھی جیل میں ہوتے۔ یہ بادشاہت میں رہنے کا پہلا سبق تھا۔

اگلے سال میری مصروفیت کافی بڑھ گئی، ہم نے الاباما یونیورسٹی کے تیار کردہ مین فریم لبارٹری پیکج انسٹال کیا، لیبارٹری والوں کو اس کی تربیت دی، اسی سال امریکہ کے شہر بوسٹن میں ایک فارمیسی کانفرنس ہو رہی تھی جس میں مجھے فارمیسی مینجر اور سینئر فارماسسٹ اسٹیو شیرلنگ کے ساتھ شرکت کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ اس کانفرنس میں ہمیں فارمیسی انونٹری مینجمنٹ کے کچھ پیکجز چیک کرنا تھے۔ بعد میں ہمارے ساتھ فارمیسی کے ڈائریکٹر سلیمان السلامہ بھی شامل ہو گئے تھے۔

یہی وہ سال بھی تھا جب ہم نے سعودی عرب میں رہنے کا فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ جیسا میں نے پہلے ذکر کیا تھا کہ میری پہلی ترجیح اپنے بچوں کو مذہب کی تعلیم دینا اور انہیں اسلامی معاشرے میں پالنا پوسنا تھا۔ جب بھی موقع ملتا میں انہیں مسجد لے جاتا، گھر میں قرآن پڑھانے کے لیے استاد کا بھی بندوبست کر دیا۔ میری پوری کوشش تھی کہ میرے بچے دین کو اچھی طرح سمجھ سکیں، اور غلط فہمیوں اور بدعات وغیرہ سے دور رہیں۔

یوں تو اس بات کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ بچے بڑے ہونے کے بعد اپنے مذہب اور دین پر کتنا عمل کریں گے۔ ایک بار جب بچے بالغ ہو جاتے ہیں تو پھر ان کی زندگیوں میں والدین کا عمل دخل بھی کم ہو جاتا ہے۔ گھر کی تعلیم و تربیت اپنی جگہ لیکن بہت سی چیزیں بچوں پر بھی منحصر ہوتی ہیں۔ بچے جب آپ دوستوں سے ملتے ہیں، باہر جاتے ہیں، اسکول میں مختلف لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں تو ان کی سوچ و فکر بھی بدلتی رہتی ہے۔ بطور والدین ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ان کی رہنمائی کریں اور ممکنہ حد تک نصیحت اور تحفظ فراہم کرتے رہیں جس کے وہ مستحق ہیں۔

سعودی عرب جانے اور رہنے کے میرے دو ہی مقصد تھے، ایک اپنا معیار زندگی بہتر کرنا اور دوسرا یہ یقینی بنانا کہ ہمارے بچوں کی مذہبی جڑیں اور بنیادیں مضبوط ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ میرے بچے سمجھدار ہو جائیں گے، دینی دنیاوی اور روحانی طور پر۔ ہم سب اخر کار انسان ہیں اور زندگی میں غلطیاں کرتے رہتے ہیں، جو لوگ اپنی غلطیوں سے سیکھتے ہیں وہی زیادہ کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔

۱۹۸٦ میں ہی میں والدین کیلئے حج کا پورا انتظام کروا دیا۔ یاسمین اور میں نے بھی حج کی تیاری شروع کردی - والدین کا حج کامیابی سے ہو گیا لیکن ہم دونوں کو کافی پریشانی ہوئ بحرحال اس کا ذکر کرنے سے کوئ فائدہ نہیں۔ البتہ ہم نے ایک بار پھر ۱۹۸۷ میں حج عبدلعزیز کھوگیر والوں کے ساتھ کیا اور الحمدوللہ کافی آسانی سے ہو گیا - اللہ ہم سب کے حج قبول کرے - آمین

ہیوسٹن میں جو دوست احباب ہم چھوڑ کر آئے تھے ان میں سے کئی کے بچے عالم دین بن گئے اور کئی گمراہ ہو گئے۔ میرے لیے سعودی عرب میں گزرے ہوئے سال بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔یہاں مجھے مذہب کو سمجھنے میں کافی مدد ملی۔ میں نے عربی کی کلاسز بھی لینا شروع کر دی تھیں۔ سعودی وزارت نے مجھے صحیح البخاری اور صحیح المسلم مستند حدیث کی دونوں کتابیں بھی فراہم کر دی تھیں۔ بچوں کے لیے بھی روز رات کو سونے سے پہلے حدیث کی کتابیں پڑھنا معمول بن گیا تھا۔مجھے کئی علماء کی کتابوں کے انگریزی ترجمے بھی مل گئے ۔ اللہ کے فضل سے ہم سال میں کم از کم ایک یا دو بار عمرے کی سعادت حاصل کرتے، رمضان کے کچھ دن حرم میں گزارتے۔ اسی دوران ہم نے دو حج بھی مکمل

کر لیے ۔ اللہ ہماری تمام عبادات قبول فرمائے، آمین۔ امید ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں ہماری زندگی کے تجربات سے سبق سیکھیں گی۔

اسی اثنا میں میں نے کراچی میں ایک اپارٹمنٹ خرید لیا جو تیار ہو چکا تھا، مجھے اس کی چابیاں لینے کے لیے کراچی جانا تھا، اور اپنے والدین کے لیے عمرے کے ٹکٹ کا بندوبست بھی کرنا تھا۔ جنوری ۱۹۹۰ میں میرے والدین کو عمرے کا ویزہ ملا اور وہ جدہ آگئے۔ ان دنوں سردی زیادہ تھی لیکن انہوں نے خوب لطف اٹھایا۔ بدھ کے روز دوپہر کے وقت ہم عمرے کی نیت سے مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مکہ پہنچ کر ہوٹل میں سامان وغیرہ چھوڑ کر پہلے رات کا کھانا کھانے کے لیے گئے اور واپس حرم آگئے۔ یہ میری زندگی کا بہترین عمرہ تھا، میرے والد میرے دائیں طرف اور میری والدہ میرے بائیں طرف تھی، ان لمحات کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ہم نے مقام ابراہیم کے سامنے نوافل ادا کیے اور زمزم کا پانی پیا۔ اب ہمیں سعی کرنا تھی۔ والدہ کے لیے پیدل چلنا مشکل تھا، ان کے لیے ہم نے ویل چیئر کا انتظام کیا۔ سعی مکمل کرنے کے بعد دوبارہ اب زمزم کا پانی پیا اور اپنے بھائی بہنوں بچوں اور پورے خاندان کے لیے ڈھیر ساری دعائیں کیں۔ اس طرح ہمارا عمرہ مکمل ہوا اور ہم ہوٹل واپس آکر سو گئے۔

صبح فجر کی نماز ہم نے حرم میں ادا کی۔ ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد مدینہ جانے کے لیے ٹیکسی کر لی۔ مغرب کے قریب ہم مدینہ پہنچے اور سامان ہوٹل چھوڑ کر فورا ہی مسجد نبوی کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہاں ہم نے مغرب اور عشاء کی نماز ادا کی اور رات کا کھانا کھانے کے بعد ہوٹل آکر سو گئے۔ صبح فجر

کی نماز پڑھ کر میں اور والد صاحب زیارت کے لیے نکل گئے، والدہ کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد خود ہی زیارت کے لیے نکل گئیں۔ ہم نے مسجد کے مختلف حصے دیکھنا شروع کیے جن میں وہ جگہ بھی شامل تھی جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی اور مسجد کا وہ چھوٹا سا حصہ جسے جنت کا حصہ کہا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں والدہ بھی آگئیں اور ہم مسجد کے عقب میں واقعہ قبرستان جنت البقیع دیکھنے کے لیے چل دیے جہاں بہت سے شہدائے جنگ، تیسرے خلیفہ عثمان بن عفان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے ابراہیم اور بہت سے لوگ جن میں ان کی بیویاں بھی شامل ہیں دفن ہیں۔ ظہر کی نماز اور کھانے کے بعد ہم لوگ ریاض جانے کے لیے ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ پورا سفر نہایت اطمینان اور آرام سے گزرا، میرے والدین بھی بہت خوش تھے اور میرے لیے یہ ایک نہایت یادگار سفر تھا۔

جیسے ہی میرے والدین پاکستان روانہ ہوئے ہم نے اپنے پہلے سفر پر دوہا، قطر جانے کی تیاری شروع کر دی جہاں میری ایک سالی صاحبہ کئی سالوں سے مقیم تھیں، یہ مارچ ۱۹۹۰ کی بات ہے۔ اسی سال موسم گرما کی چھٹیوں میں ہمیں کراچی جانا تھا جس کے لیے ہم سب بہت پرجوش اور پر اشتیاق تھے اس لیے کہ اس دفعہ ہم اپنے گھر میں ٹھہرنے والے تھے۔ جولائی کے اوائل میں بچے کراچی کے لیے روانہ ہو گئے مجھے کچھ عرصے کے بعد جانا تھا۔

میری بیوی نے بڑی لگن اور محنت سے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر اپارٹمنٹ کا سارا سامان خرید لیا جس کے لیے میں اس کا بہت شکر گزار ہوں۔ کچھ ہی دنوں بعد میں بھی کراچی پہنچ گیا۔ یاسمین نے

اپرٹمنٹ کو بہت خوبصورت طریقے سے سیٹ کر لیا تھا، یہ اب ہمارا اپنا گھر تھا۔ اس کے دونوں طرف گیلریاں تھیں جہاں کھڑے ہو کر آپ پورے شہر کا نظارہ کر سکتے تھے۔ گیلریوں کے ساتھ دو ایئر کنڈیشن بیڈ روم تھے۔ درمیانی کمرے کی بڑی کھڑکی سے قائد اعظم کا مقبرہ نظر اتا تھا۔ ہم نے بائیں طرف والا اور بچوں نے دائیں طرف والا کمرہ لے لیا۔

میری آخری بہن حسینہ کی شادی قریب تھی، اس کے لیے کافی سامان ہم نے ریاض سے ہی خرید لیا تھا جب میرے والدین عمرے کے لیے آئے تھے۔ میں نے کرائے پر گاڑی لے لی تھی۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی ابراہیم سارے شہر کا چکر لگاتے رہتے، ہم نے شادی اور دیگر فنکشنز کے انتظامات اور کھانے پینے کے ارڈر دیے۔ تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں، حسینہ بہت خوش تھی۔ گرمیوں کا موسم تھا، میں نے اور یاسمین نے مشورہ کیا کہ ہمیں حسینہ کو اپنے گھر پر ایئر کنڈیشن کمرے میں شادی کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ حسینہ کو ٹھنڈے کمرے میں تیار ہونے کا بہت مزہ آیا۔ اسے تیار کرا کے ہم والدین کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے جہاں سے ہمیں شادی کی مقام کی طرف جانا تھا۔

شادی خیر و عافیت سے انجام پائی۔ میری چھٹیوں کے دن بھی ختم ہو رہے تھے اور میرے پاس اب مزید کوئی چھٹی بھی باقی نہیں تھی۔ جب ہم کراچی سے جہاز میں سوار ہوئے تو کپتان نے کیبن میں آ کے اعلان کیا کہ کویت پر صدام حسین نے قبضہ کر لیا ہے، یہ ایک عجیب خبر تھی، ہمیں اس وقت اندازہ ہی نہیں تھا کہ اگلے چند سالوں میں اس کی وجہ سے کتنی مصیبتیں آئیں گی۔ سعودیہ پہنچتے ہی

ہسپتال والوں نے مجھے ایک اہم میٹنگ میں شرکت کے لیے امریکہ جانے کے احکامات دے دیے۔ غرضیکہ کے ۱۹۹۰ کا پورا سال سفر میں ہی گزرا جس کا ہم نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

مارچ ۱۹۹۱ کے اوائل میں ہم نے یاسمین کی بڑی بہن رخسانہ اپا اور ان کے شوہر عارف بھائی سے دوہا قطر ملنے جانے کا فیصلہ کیا۔ دوہا اچھی جگہ ہے یہاں ک ساحل سمندر ہیں۔ یہ ریاض کی طرح گرم ہے پھر بھی مارچ میں اچھا اور ٹھنڈا رہتا ہے۔ ہم نے کئی ساحل سمندر اور زیر تعمیر شہروں کی سیر کی۔

۱۹۹۳ سے ۱۹۹۷ تک ہم لوگوں نے چھٹیوں میں کئ ملکوں اور شہروں کا سفر کیا - ان سفر کی کہانیاں اور تصاویر آپ میری انگریزی کتاب میں ملاحظہ کر سکتے ہیں-

جب ہم جنوری ۱۹۹۸ میں کراچی گئے تو میں نے اپنے گھر والوں کو بتایا کہ میں اگست تک سعودی عرب چھوڑ کر واپس امریکہ چلا جاؤں گا تاکہ بچے امریکہ میں اپنی ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کر سکیں۔ میرے والدیہ سن کر کافی پریشان ہوئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سعودی عرب کی بہ نسبت امریکہ سے بار بار پاکستان آنا اسان کام نہ تھا۔ اس سفر میں میں نے بہت اچھا وقت اپنے والد صاحب کے ساتھ گزارا۔

اپریل ۱۹۹۸ مجھے یونس موٹن کا فون موصول ہوا کہ میرے والد کی طبیعت ٹھیک نہیں، اس نے بتایا کہ والد صاحب کے سینے کے ایکسرے کے تنائج کچھ اچھے نہیں ہیں اور یہ کہ مجھے گھر آنا چاہیے۔ میں فوراً اگلی فلائٹ سے پاکستان روانہ ہو گیا۔ والد کا وزن کم ہو گیا تھا, وہ واضع طور پر تکلیف میں تھے۔ میں

نے اپنے دوست ڈاکٹر محمد ظفر سے بات کی، جو میرے ڈی جے کالج کے ساتھی بھی تھے اور کنگ فیصل ہسپتال میں بھی ساتھ رہ چکے تھے۔ انہوں نے آغا خان ہسپتال میں پریکٹس کرنے والے ایک سینئر آنکولاجسٹ ڈاکٹر مجید میمن سے ملاقات کا بندوبست کروا دیا۔

اگلے دن میں ڈاکٹر ظفر کے ساتھ اپنے والد کو لے کر ڈاکٹر میمن سے ملنے چلا گیا۔ ڈاکٹر میمن نے کئی لیب ٹیسٹس وغیرہ کروائے ساتھ میں بائیوپسی اور سی ٹی اسکین بھی کروانے کے لیے کہا۔ اس دن جمعرات تھی اور رپورٹ پیر ۱۸ مئی ۱۹۹۸ کو ملنا تھی۔ میرے والد صاحب کو شاید احساس ہو گیا تھا کہ انہیں کوئی مہلک بیماری لاحق ہے، انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا کے اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہو جائے تو میں اس بات کو یقینی بنائوں کے انکا گھر میری والدہ اور میری طلاق یافتہ بہن کو ملے۔ میں نے والد سے وعدہ کیا اور ہفتہ کی رات کو واپس جدہ کے لیے روانہ ہو گیا اس شرط کے ساتھ کے میں ایک ہفتہ کے بعد پھر واپس آؤں گا۔

اگلے دن ۱۷ مئی کو جب میں کام پر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو یونس موٹن کا مجھے دوبارہ فون ایا، اس نے میری زندگی کی سب سے اندوہناک خبر سنائی، میرے والد اس جہان فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ مجھے اور یاسمین کو اسی دن ایگزٹ انٹری ویزا کے لیے دوبارہ اپلائی کرنا پڑا، ہم بچوں کو یاسمین کے بھائی شعیب کے پاس ریاض میں چھوڑ کر کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔

میری والدہ اور خاندان کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا، سبھی غمزدہ تھے۔ میرے بھتیجے فیصل اور کزن یونس نے مکہ مسجد میں اخری رسومات کے انتظام میں میری کافی مدد کی۔ گرمی کی وجہ سے گھر والوں

نے میرے کہنے پر تدفین کو نہیں روکا اور ان کو اسی دن دفنا چکے تھے - میرے آنے پر تیسرے روز مسجد میں ختم القرآن رکھا تھا - والد صاحب کے تقریبا تمام دوست شرکت کے لیے مسجد آ گئے تھے۔ صدیق زکریا موٹن، زکریا صدیق، یونس زکریا موٹن، مجید عمر موٹن، امین عمر موٹن، یحیی ہاشم باوانی، بشیر چرا، خاندان کے دوسرے لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ میں صدیق زکریا موٹن کا اداس چہرہ کبھی نہیں بھول سکتا جس نے مجھے پکڑ کر کندھے پر سر رکھ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ یقینا وہ مرتے دم تک میرے والد کو نہیں بھولا تھا۔

میں نے آغا خان ہسپتال سے جا کر اپنے والد صاحب کی رپورٹس لے لیں۔ ان رپورٹ سے پتہ چلا کہ ان کو پھیپھڑوں کا کینسر کافی بڑھ چکا تھا، لیکن انہوں نے کبھی درد کی شکایت نہیں کی۔ وہ میرے بھانجے فیصل، بہن گلبانو (عائشہ) اور میری والدہ کے سامنے فجر کی نماز کے بعد خاموشی سے خالق حقیقی سے جا ملے۔ دوسرے دن میرے بہنوئی محمود کامدار جنہیں میں اپنا بھائی سمجھتا ہوں مجھے قبرستان لے گئے۔ والد صاحب کی قبر دیکھنا ایک مشکل کام تھا جو مٹی سے ڈھکی ہوئی تھی۔ سب کی آخری منزل یہی ہے، کسی کو پتہ نہیں کہ کب اور کہاں وہ اس جہان سے رخصت ہو جائے۔پیدائش کے ساتھ ساتھ موت کا وقت بھی مقرر ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کتنے صحت مند ہیں یا امیر ہیں۔ موت سے کسی کو استثنا حاصل نہیں۔

میں نے اس سے پہلے والے سفر کے دوران ہی ایک مقامی وکیل لطیف شاو کے بیٹے اقبال شاو سے وصیت نامہ تیار کروا لیا تھا جس میں ایک شق ڈلوا دی تھی کہ موجودہ گھر میری بہن عائشہ کو والدہ کے انتقال کے بعد ملے گا۔ لیکن چند سالوں بعد میری والدہ نے گھر بیچ دیا اور اس میں سے کچھ رقم امریکہ جانے اور دیگر اخراجات کے لیے اپنی بہن اور اس کے بیٹے کو دے دی۔ اس وقت تو یہ خبر سن کر مجھے کافی افسوس ہوا تھا لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ انہوں نے ٹھیک ہی کیا۔ انہی کے نام کا تھا وہ جو چاہے کر سکتی تھیں۔ لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ وہ گھر میری بہن حسینہ نے ہی خرید لیا تھا۔ وہ آج بھی اسی گھر میں رہ رہی ہے۔

میں نے اپنے باس حماد الدائج کو ایک سال بعد نوکری چھوڑنے اور امریکہ منتقل ہونے کے بارے میں آگاہ کر دیا۔ ریاض میں سعودی امریکن انٹرنیشنل اسکول جس میں ہمارے دونوں بچے پڑھتے تھے صرف نویں جماعت تک تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ شرمین اپنی دسویں اور گیارویں جماعت منارۃ الریاض، ایک عربی انگلش اسکول سے پڑھ لے اس طرح نعمان اپنی نویں جماعت امریکن اسکول سے پوری کر لے گا۔

ہم نے نعمان کی گریجویشن تقریب میں شرکت کی جبکہ شرمین نے بھی گیارویں جماعت مکمل کر لی۔ یہ ۱۹۹۸ کے موسم گرما کی بات ہے۔ ہم ابھی تک والد کو کھونے کے صدمے سے دوچار تھے۔ ۱۳ سال سے زیادہ عرصہ سعودی عرب میں کام کرنے کے بعد ہم نے واپس امریکہ جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یاسمین نے چیزیں چھانٹنا شروع کر دیں، ساتھ لے جانے والا سامان علیحدہ کر کے باقی برائے

فروخت کے اشتہارات دے دیے۔ جلد ہی زیادہ تر اشیا بک گئیں۔ مجھے اپنی فور ویل ڈرائیو گاڑی کا خریدار پہلے ہی مل گیا تھا جو وسط جولائی ۱۹۹۸ تک میرے پاس گاڑی چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں نے ارسی جی کے ساتھ مشاورتی پوزیشن کے لیے درخواست دی تھی۔ انہوں نے فون پر میرا انٹرویو لیا اور نوکری کی پیشکش کر دی۔ پیشکش اچھی تھی میں نے قبول کر لی لیکن اس میں سفر کے اخراجات شامل نہیں تھے۔ مجھے آٹھ ستمبر سے کام شروع کرنا تھا جبکہ کنگ فیصل ہسپتال سے مجھے ۲۱ ستمبر ۱۹۹۸ تک کی تنخواہ ملنی تھی۔

ہم نے نقل مکانی کرنے والی کمپنیوں میں سے ایک سے رابطہ کیا جو گھر آ کر تمام سامان پیک کر کے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے ہمیں ہیوسٹن میں سامان کی ترسیل کے لیے ۲۱ اگست ۱۹۹۸ کی تاریخ دی۔ نقل مکانی کا تمام خرچہ شاہ فیصل ہسپتال نے اٹھایا۔ ساتھ میں میری پینشن وغیرہ کی بھی ادائیگی کی۔

کنگ فیصل ہسپتال کے بہت سے دوستوں نے ہمیں الوداعی پارٹی پر مدعو کیا جس میں ائی ٹی ڈیپارٹمنٹ کی ایک شاندار دعوت بھی شامل ہے۔ ہم نے ہیوسٹن جانے کے لیے ۸ اگست ۱۹۹۸ کہ ٹکٹ بک کروا لیے۔ میں نے اپنے بھائی اشرف کو اپنے آنے کی اطلاع کر دی اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ وہ شہر کے شمال مغربی حصے میں، جہاں ہم سعودی عرب جانے سے پہلے مقیم تھے, کوئی گھر وغیرہ ڈھونڈنا شروع کر دے۔

باب ۸

۱۹۹۹ - تا دمِ تحریر

ہماری فلائٹ وقت پر ہیوسٹن پہنچ گئی میرے بھائی اشرف کی فیملی ہمارے استقبال کے لیے پہلے سے موجود تھی ہم ان کے ساتھ ان کے اپارٹمنٹ میں ٹھہرے جو شہر کے شمال حصے میں واقع تھا۔ اگلے دن ہم نے کرکوڈ روڈ پر اپنا اپارٹمنٹ بک کروا لیا اشرف نے ہمیں شہر کے اس علاقے میں بہت سے گھر دکھائے لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے خاندان کے لیے موضوع نہیں لگا۔ اسی دوران میں نے ایک مناسب قیمت کی نسان گاڑی ۱۴ ہزار ڈالر کیش دے کر خرید لی- ہم پر کوئی قید نہ تھی ہم ارام سے جہاں چاہے جا سکتے تھے اگست کے چوتھے ہفتے سے اسکول شروع ہونے والے تھے میں نے بچوں کا داخلہ لینگھم کریک ہائی سکول میں کروا دیا، جیسے ہی اسکول شروع ہوئے میری ڈیوٹی لگ گئی صبح بچوں کو اسکول چھوڑوں اور دوپہر کو تین بجے واپس لاؤں-

اخر کار یاسمین نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ویسٹ لٹل یورک اور ایڈکس ستسوما کے قریب سوانہ اسٹیٹس میں ایک گھر نکالا جو اب تک دیکھے گئے گھروں میں سب سے بہتر لگ رہا تھا یہ ایک نئی سب ڈویژن میں ایک نیا گھر تھا جس کی قیمت ایک لاکھ ۵۴ ہزار ڈالر تھی میں نے بلڈر سے درخواست کی کہ وہ میرے بھائی

اشرف کو بطور ریلٹر لسٹ کر لے تاکہ وہ کمیشن حاصل کر سکے ہم نے معمولی سی ادائیگی کر کے گھر خریدنے کے لیے درخواست جمع کرا دی اور اس کے منظور ہونے کا انتظار کرنے لگے جیسے ہی بینک سے قرضہ منظور ہوا ہم نے ڈاؤن پیمنٹ دے کر گھر خرید لیا۔

پہلی ستمبر ۱۹۹۸ کو ہم اپنے گھر میں شفٹ ہوئے، گھر کے لیے فرنیچر بھی چاہیے تھا، اس زمانے ہیوسٹن میں فنگر فرنیچرز کافی مشہور تھا، اس کے کئی شورومز تھے۔ مختلف شورومز کا چکر لگانے کے بعد فرنیچر خرید لیا گیا۔ اب ہمیں سعودی عرب سے بھیجے گئے سامان کا انتظار تھا۔

میں نے آٹھ ستمبر ۱۹۹۸ کو ارسی جی کنسلٹنگ کے ساتھ کام شروع کیا، گاڑی چلانا یوں تو میرے لیے مشکل نہ تھا لیکن گاڑی چلا کے کام پر جانا ہے مجھے عجیب سا لگ رہا تھا اس لیے کہ میں سعودی عرب میں گھر سے نکل کر پیدل ہی کام پر پہنچ جاتا تھا، یہاں تو یہ حال تھا کہ ایک روٹی بھی خریدنی ہو تو گاڑی پر جانا پڑتا تھا۔

نئے گھر میں شفٹ ہونے کے دو ہفتے بعد ہی سعودی عرب سے ہمارا سامان پہنچ گیا۔ سامان کھول کر تمام چیزیں اپنی اپنی جگہ پر رکھنا شروع کر دیں اور دو تین دن میں پورا گھر سیٹ ہو گیا۔ وقت پر اذان دینے والی خودکار مشین بھی سیٹ کر دی تاکہ نماز وقت پہ ادا ہو سکے۔ ہمیں فکر تھی کہ کہیں کچھ کھو نہ گیا ہو لیکن شکر ہے کہ تمام سامان خیر خیریت سے پہنچ گیا، سوائے ایک جھاڑو کے۔ کئی سال گزرنے کے بعد پرانے دوستوں سے دوبارہ ملنا جلنا شروع ہو گیا۔ ہم واپس امریکہ آکر بہت خوش تھے۔

میں نے نسان کی جگہ نئی گاڑی آلیرو لے لی، یاسمین کے پاس فورڈ ایسکورٹ تھی اسے ایک وین دلا دی۔ یاسمین نے فورڈ ایسکورٹ پر شرین کو گاڑی چلانا سکھا دی، اسے جلد ہی ڈرائیونگ لائسنس بھی مل گیا۔ اسی دوران شرین نے ہیوسٹن یونیورسٹی میں انڈر گریجویٹ ایم ائی ایس میں داخلہ لے لیا۔ نعمان کے ہائی اسکول ختم ہونے میں ابھی دو سال باقی تھے۔ اس نے اپنی سالگرہ کے دن ۱۰ جون ۱۹۹۹ کو اپنا ڈرائیونگ حاصل کیا، اسے میں نے ایک پرانے ماڈل کی گاڑی خرید کر دے دی۔ اس طرح گھر میں چار گاڑیاں ہو گئیں۔ خرچہ کافی بڑھ گیا تھا، مجھے گاڑیوں کی انشورنس، میڈیکل، گھر کی اقساط اور اس کا انشورنس وغیرہ بھی ادا کرنا پڑ رہا تھا۔

بچے سعودی عرب جانے کا پروگرام بنانے لگے۔ میں نے اپنے سابق باس اور اپنے بہنوئی شعیب کی مدد سے ویزا حاصل کیا اور ہم سب ریاض کے لیے روانہ ہو گئے۔ کچھ دن ریاض میں گزارنے کے بعد ہم نے عمرہ ادا کیا، مدینہ حاضری دی اور بچوں کے اسکول کھلنے سے پہلے پہلے واپس امریکہ آ گئے۔

ارسی جی نے مجھے ابتدائی طور پر بینک اف امریکہ کے ساتھ سنہ ۲۰۰۰ کا پروجیکٹ کرنے پر معمور کیا تھا، لیکن کچھ عرصے بعد میموریل برمن کے پروجیکٹ سنہ ۲۰۰۰ پر بھیج دیا جسے تیزی سے پورا کرنا تھا، اس لیے کہ ۱۹۹۹ کا سال ختم ہونے کو تھا۔ میموریل برمن نے مجھے مستقل نوکری کی پیشکش کی جس کے لیے میں نے معذرت کر لی، میں اس وقت اپنے آپ کو ارسی جی کا وفادار سمجھ رہا تھا۔ یہاں مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی کیونکہ سنہ ۲۰۰۰ شروع ہوتے ہی پروجیکٹ بھی ختم ہو گیا اور مجھے یکم جنوری ۲۰۰۰ تک کی تنخواہ کا چیک دے کر رخصت کر دیا گیا۔

اسی سال یعنی سنہ ۲۰۰۰ میں مجھ سے ایک اور بڑی غلطی ہوئی، میں نے اپنے پرانے دوست رفیق لویا کے ساتھ بزنس میں کچھ پیسہ لگا دیا، بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ الٹے سیدھے بہانوں سے چیک کیش کرا کر اپنا قرضہ اتار رہا ہے۔ اس سرمایہ کاری کی وجہ سے مجھے کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ میں پہلے ہی گھر خریدنے کے لیے بھاری رقم ادا کر چکا تھا۔ فرنیچر خریدنے پر بھی کافی رقم خرچ ہوئی تھی، اوپر سے گاڑیوں کا خرچہ، انشورنس میڈیکل وغیرہ وغیرہ اور سب سے بڑا مسئلہ کہ میں بے روزگار ہو چکا تھا۔

میں روزانہ مختلف ہسپتالوں کے آئی ٹی ڈیپارٹمنٹس میں نوکری کی درخواستیں جمع کرواتا لیکن کہیں سے کوئی مثبت جواب نہیں آ رہا تھا، شاید اس لیے کہ آئی ٹی والے ابھی تک سنہ ۲۰۰۰ کے مسئلے مسائل نپٹانے میں مصروف تھے۔ مارکیٹ میں آئی ٹی کے پیشہ ور افراد کی بھرمار تھی۔ دو مہینے کی تگ و دو کے بعد میں کافی مایوس ہو چکا تھا، ایسے میں ہیرس کاؤنٹی ہسپتال نے مجھے ایپلیکیشنز مینیجر کی جاب آفر کی، لیکن تنخواہ بہت کم تھی، مجبوراً میں نے اسے غنیمت سمجھا اور جوائن کر لیا۔ کام میرے لیے بہت آسان تھا کیونکہ میں پہلے سے ہی صحت کی درخواستوں کے تمام ورک فلو سے واقف تھا۔ دو مہینے کے اندر ہی مجھے سی آئی او کے دفتر بلا کر تمام ذیلی شعبہ جات کی نگرانی کے لیے انتظامی عہدے کی پیشکش کی گئی۔ یہ ایک چیلنجنگ پوزیشن تھی جس میں لیبارٹری/پیتھالوجی، فارمیسی، ریڈیولوجی، کارڈیولوجی، پلمونری لیب، جی ائی لیب اور کئی دیگر چھوٹے شعبوں کی ذمہ داریاں شامل تھیں۔ ساتھ میں مدد کے لیے ایک فارمیسی پرسن بھی دے دیا گیا۔ لیبارٹری اور ریڈیالوجی کے شعبہ جات کا اپنا آئی ٹی سپورٹ کا عملہ تھا۔ مجھے سی آئی او نے انہیں بھی آئی ٹی کے ماتحت لانے کا کہا تھا۔

رفیق لویہ مجھ سے کٹنے لگا، فون کا جواب بھی نہیں دیتا تھا۔ اخر ایک دن پتہ نہیں کہاں سے وہ نمودار ہوا، اس نے مجھے مختلف تاریخوں کے کئی چیک لکھ کر دیے اور تاکید کی کہ انہیں کیش کرانے سے پہلے میں فون کر کے اس سے کنفرم کر لوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ بینک میں پیسے نہ ہوں اور چیک باؤنس ہو جائے۔ ادھر نعمان نے کالج ختم کر کے یونیورسٹی آف ہیوسٹن میں داخلہ لے لیا، یہ اگست ۲۰۰۱ کی بات ہے۔

ایک دن لویا ایک اور شخص فاروق صمد کو لے کر میرے پاس آیا، ان دونوں نے بتایا کہ ہم کوئی ڈھائی ملین ڈالر کا اپارٹمنٹ کمپلیکس خریدنے کا سوچ رہے ہیں اور اس کے لیے ایک کارپوریشن بنانا چاہتے ہیں، انہوں نے کہا کہ ہمیں اپ سے پیسے نہیں چاہیں اپ صرف اس کارپوریشن کے صدر بن جائیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہر ماہ جو منافع آئے گا اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا کریں گے اور جب دو ڈھائی سال بعد اسے بیچیں گے تو اچھا خاصا منافع ملے گا۔ لویا نے کہا کہ وہ میرا سارا قرضہ بھی اتار دے گا۔ رفیق لویہ نے مجھے چونکہ کچھ نہ کچھ پیسے واپس کرنا شروع کر دیے تھے اس لیے میرا اس پر کچھ اعتماد بحال ہو گیا تھا۔ میں نے حامی بھر لی۔ وعدے کے مطابق ہر مہینے کچھ نہ کچھ منافع آنا شروع ہو گیا۔ میں پر اطمینان تھا کہ چلو کم از کم میرا دیا ہوا قرض واپس مل رہا ہے۔ کوئی ۱۸ ماہ بعد یہ لوگ بہانے بنانے لگے کہ بہت سے اپارٹمنٹ خالی پڑے ہیں کرایہ دار نہیں ہیں اور ہمیں نقصان ہو رہا ہے۔ اپارٹمنٹ میں جرائم اور دو قتل کی بھی اطلاعات تھیں۔

چند مہینے بعد مجھے خبر ملی کہ اپارٹمنٹ ۳۔۴ ملین ڈالر میں بیچ دیا گیا ہے، میں بڑا حیران ہوا کہ کارپوریشن کا صدر تو میں ہوں بغیر میری اطلاع اور کاغذی کاروائی کے اپارٹمنٹ کیسے بک گیا۔ رفیق لویہ کو بھی پتہ نہیں تھا، اسے بھی سمجھ نہیں آیا کہ کیا ہوا، ہم دونوں کے ساتھ دھوکہ ہو گیا تھا۔ ہم نے ایک وکیل سے بات کی، اس نے کاغذات کی جانچ پڑتال کے بعد بتایا کہ میرا نام صدر کے عہدے سے دو مہینے پہلے ہی ہٹا دیا گیا تھا۔ بہرحال فاروق صمد ہم سب کو دھوکہ دے کر بھاگ نکلا تھا۔ بعد میں رفیق مجھے کبھی کبھار دو ڈھائی سو ڈالر کی ادائیگی کر دیا کرتا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ صرف اس لیے ادائیگی کرتا تھا کہ کہیں اس پر میں کوئی قانونی چارہ جوئی نہ کر دوں۔ تمام ادائگیاں نکالنے کے بعد بھی وہ میرا ۸۷ ہزار ڈالر کا مقروض تھا۔

کمپنی سے مجھے اچھی تنخواہ ملتی تھی میں اپنے عہدے اور ذمہ داری سے بھی بہت خوش تھا۔ صرف ایک مسئلہ تھا وہ یہ کہ فیصل ہسپتال میں ہم مختلف کانفرنسوں میں پیپر وغیرہ پڑھنے جایا کرتے تھے لیکن یہاں اس قسم کی کوئی سرگرمیاں نہیں تھیں، تاہم مجھے ہر سال ۳۸ دن کی چھٹی تنخواہ کے ساتھ ملتی۔ چھٹیاں زیادہ تر سعودی عرب اور پاکستان میں گزرتیں۔ اسی عرصے میں باوجود میرے منع کرنے پر میری والدہ عائشہ اور اس کے بیٹے فیصل کے ساتھ امریکہ شفٹ ہو گئیں، کچھ عرصے شکاگو میں رہنے کے بعد وہ میری لینڈ چلی گئیں۔

کہتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے، جو گھر ہم نے ۲۰۰۱ میں خریدا تھا یاسمین اس سے ایک بہتر جگہ کی تلاش میں تھی جہاں ہم اپنا گھر خود بنا سکیں۔ ایک دن شرین گھر آئی تو بتایا کہ اس

نے ایلڈرج اور ویسٹ لٹل یورک کے قریب ایک جگہ دیکھی ہے جہاں ابھی ابھی نئے کام کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے۔ مجھے کچھ یقین نہیں آیا کیونکہ یہ جگہ شہر کے اس علاقے میں تھی جہاں زمین ملنا کافی مشکل تھا۔ ہم شام کو جگہ دیکھنے گئے، بلا شبہ بلڈرز نے ایک زرعی زمین لے کر اسے رہائشی علاقے میں تبدیل کروا لیا تھا۔ یہ ایک خوبصورت علاقہ تھا جس کے بیچ میں ایک جھیل بھی بنی ہوئی تھی- ہمیں علاقہ بہت پسند آیا آخر گھومنے پھرنے کے بعد ہمیں ویسٹ لٹل یورک کے قریب ترین ایک پلاٹ پسند آیا جو چاریڈ رومز کے گھر کے لیے کافی موزوں تھا۔ طے ہوا کے اسے ہی بک کر لیا جائے، گھر کی لاگت کوئی ڈھائی لاکھ آرہی تھی۔ واپس آکر ہم نے صلاح مشورہ شروع کیا کے اگر جھیل کے پاس گھر لیں تو زیادہ اچھا ہو گا، لاگت کا فرق تقریباً پچاس ہزار تھا۔ آخر کار فیصلہ ہوا کے گھر جھیل کے پاس ہی لینا چاہیے۔ ہم نے جھیل والی لاٹ میں سے ایک ماڈل پسند کیا جس کا رقبہ ۳۶۹۵ مربع فٹ تھا، یاسمین نے اس میں اپنی پسند کے حساب سے کچھ تبدیلیاں وغیرہ کراوئیں اور ہم نے سودا طے کر لیا۔ جس دن معاہدہ پر دستخط ہوئا تھے وہ بقر عید کا دن تھا، عید کی نماز پڑھنے کے بعد ہم نے معاہدہ پر دستخط کر دیے۔

پرانا گھر بیچنے کے لیے ایک اسٹیٹ ایجنٹ نے ہمیں اپنے کمیشن میں ڈیڑھ فیصد ڈسکاؤنٹ دینے کی آفر کی، ساتھ ہی بلڈر سے جو کمیشن ملنا تھا اس پر ڈھائی ہزار ڈالر دینے کی بھی پیشکش کر دی۔ مجموعی طور پر پرانا گھر بیچ کر نیا گھر خریدنے سے ہمیں کچھ منافع ہی ہو رہا تھا۔ ہم نے سوچا جب تک گھر بن رہا ہے کیوں نہ چھٹیاں کراچی میں گزاری جائیں-

جب ہم کراچی سے واپس پہنچے تو گھر تیار تھا۔ ہم نے کوئی ستر ہزار کے قریب ڈائون پیمنٹ اور پندرہ سال کی مارٹگیج پر بینک سے معاہدہ کیا۔پیمنٹ کے دوران مجھ سے کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوئیں جسکی وجہ سے مجھے کچھ نقصان اٹھانا پڑا، ایک تو میں نے دو بار اسے ریفاینانس کراویا، دوسری دفعہ لچک دار شرح پر فنانسنگ کروا لی اور تیسری دفعہ ۱۰ سال پر فکسڈ فنانسنگ۔ انسان اپنی غلطیوں سے ہی سیکھتا ہے۔ لیکن کم از کم یہ ضرور ہوا کہ پندرہ کے بجائے دس سال میں ادائیگی ہو گئی۔ اسی سال نعمان نے ہائی اسکول سے گریجویشن مکمل کر لی۔

ادھر میری کمپنی کے سی ای او اور سی آئی او کے درمیان کچھ اختلافات شروع ہو گئے، نئی سی آئی او دو سال کے کانٹریکٹ پر آئی تھی ۔ یہ جیسا کام چل رہا ہے ویسے ہی چلنے دو کے چکر میں تھی۔ جب ۲۰۰۳ میں فلپ بریڈلی نے قائم مقام سی آئی او کا چارج سنبھالا تو دوبارہ سے کچھ بہتری آنی شروع ہوئی اور کچھ نئے منصوبوں پر کام شروع ہوا۔

شرمین نے ہیوسٹن یونیورسٹی سے ڈبل گریجویشن مکمل کر لیا، ایک بی ایس فنانس میں دوسرا ایم آئی ایس میں۔ ۲۰۰۳ میں اسکی کانوکیشن کی تقریب بھی اسی عمارت میں ہوئی جس عمارت میں ۱۹۷۸ میرا کانوکیشن ہوا تھا۔ میں نے کمپیوٹر سائنس میں میجر کے ساتھ نیچرل سائنس اور ریاضی میں گریجویشن کیا تھا۔ شرمین نے کچھ عرصہ یونیورسٹی کے نیٹ ورکنگ ڈپارمنٹ میں کام کیا تھا آخری سمیسٹر میں اسے ایک اچھی کمپنی میں ملازمت مل گئی۔

جب میں نے کمپنی میں کام شروع کیا تو ٹم ٹنڈل جو ہمارے کنسلٹنگ کانٹریکٹر ہوا کرتے تھے تھا چند سال بعد وہ دوبارہ ہمارے مستقل سی آئی او بن کر واپس آ گئے، جبکہ فلپ اپلی کیشن سپورٹ کے نائب سی آئی او بن گئے۔ ان دونوں کی زیر نگرانی ہم نے اپلیکیشنز انسٹالیشنز کے کئی بڑے بڑے پروجیکٹس کئے۔ زندگی کی مصروفیات بہت بڑھ گئیں تھیں، ہم چھٹیاں گزارنے ہر سال کراچی جاتے اور تقریباً ہر دوسرے سال سعودی عرب۔ ریاض میں سسرال کے علاوہ شاہ فیصل اسپتال کے دوستوں سے بھی ملاقات ہوتی، عمرہ بھی ادا ہو جاتا اور مدینے کی زیارت بھی ہو جاتی۔ کراچی میں اللہ کے فضل سے اپنا گھر تھا، ائرپورٹ سے ٹیکسی لے کر سیدھا اپنے گھر اتر جاتے، میری کوشش ہوتی کے کسی کو تکلیف نہ دوں پھر بھی کبھی کبھار یاسمین کی بہن بانوماں اپنے شوہر اقبال موتی کے ساتھ ہمیں ائرپورٹ لینے آ جایا کرتی تھی۔

جس زمانے میں نعمان کالج میں پڑھ رہا تھا شرین نے ہمیں بتایا کے اسکے ایک دوست توصیف کے گھر والے ہم سے ملنے آنا چاہتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے حیرت کی بات تھی کیوں کے کچھ عرصہ پہلے ہی اسے ایک بڑا سبق مل چکا تھا۔ ہم اس لڑکے اور اسکی فیملی سے شرین کی گریجویشن کی تقریب میں ملے تھے۔ ہم نے انہیں اپنے گھر بلا لیا اور طے یہ ہوا کے کراچی کے اگلے سفر میں ہم توصیف کی فیملی سے ملیں گے۔ لیکن اس دوران میں نے یاسمین کے بھائی شعیب سے درخواست کی کے وہ اپنی فیملی کے ساتھ جا کر لڑکے کے والد جنکا نام طارق تھا اور انکی فیملی جو اس وقت کراچی میں تھی ملاقات کر لیں۔ شعیب نے فیملی کی کافی تعریف کی لیکن میں کچھ فکر مند تھا جسکی دو وجوہات تھیں، پہلی تو شرین کی سابقہ منگنی کا تجربہ کچھ اچھا نہ تھا، دوسرے یہ کہ یہ لوگ میمن نہیں تھے، اس وجہ سے نہیں کہ میں شادی

میمنوں میں کرنا چاہتا تھا بلکہ انجان لوگوں سے رشتہ کرنے کا کچھ خوف سا تھا۔ میمنوں کی بہت سی رسومات اور ثقافت سے مجھے اتفاق نہیں، خاص طور پر ساس بہو کے مسئلے مسائل سے۔ ایسے معاملات میں سب سے بہتر کام ہے استخارہ کرنا، استخارے کا جواب مثبت آیا، میں نے شرمین سے بھی استخارہ کرنے کے لیے کہا۔

پاکستان پہنچ کر لڑکے کے والد طارق بھائی نے ہمیں گولف کلب میں مدعو کیا۔ ہمیں یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ طارق بھائی پاکستان آرمی میں لیفٹیننٹ جنرل اور کراچی کے کور کمانڈر رہ چکے تھے۔ یہ ایک نہایت ہی اچھی ملاقات رہی، لوگ بھی بہت نفیس تھے، ہم سب ان سے کافی متاثر ہوئے۔ بات طے ہو گئی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ایک سال بعد ستمبر ۲۰۰۴ میں نکاح اور شادی ہیوسٹن میں ہو گی اور ولیمہ کراچی میں۔

ستمبر ۲۰۰۴ میں ہم طارق بھائی اور انکی بیگم افشاں بھابھی کے ساتھ ہیوسٹن کے جنوب مغرب میں واقع ایک شادی حال جسکا نام سعیدہ شادی ہال تھا دیکھنے گئے، جگہ سب کو پسند آئی، ہال دو سو مہمانوں کے لیے کافی تھا- آخر ہماری پیاری بیٹی کی شادی کا دن آ ہی گیا۔ ہم اپنی مرسیڈیز میں وقت پر ہال میں پہنچ گئے، حیرت انگیز طور پر دولھا اور اسکے اہل خانہ پہلے ہی سے ہال پہنچ چکے تھے۔ یہ ایک نہایت اچھی تقریب رہی۔ لیکن افسوس کے ساتھ میرے ایک بھائی نے جو نجانے کیوں مجھ سے رنجش رکھتا تھا میرے پورے خاندان کو شادی میں شرکت کرنے سے روک دیا۔ میرے خاندان کی طرف سے صرف میرا بھائی اشرف اور اسکی فیملی شادی میں شریک ہوئی۔ اشرف نے شادی کے انتظامات میں میری

بہت مدد کی ۔ بہرالحال ان تمام باتوں سے ایک سبق ضرور ملتا ہے کہ چاہے آپ اپنے خاندان کے لئے کچھ بھی کرلیں ایک نہ ایک شخص ضرور ایسا ہو گا جو نا معلوم وجوہات کی بنا پر آپ سے بغض یا حسد رکھے گا اور ہر وقت آپ کو نیچا دکھانے میں لگا رہے گا۔

٦ اگست ۲۰۰۵ کو شرین کی تقریب ولیمہ کراچی پاکستان میں منعقد ہوئی- طارق بھائی اور افشاں بھابی نے توصیف اور شرین کے ولیمے کے لیے گولف کورس بک کرا لیا تھا۔ ہم نے اپنی طرف سے سب کو ولیمے میں شرکت کی دعوت دے دی، میری تمام بہنوں اور ان کے اہل خانہ نے شرکت کی، اشرف اور اس کی فیملی بھی مدعو تھے، اس کے ساتھ ساتھ میرے بہت سے اسکول کے دوست بھی۔

ہم جولائی ۲۰۰۷ میں بغیر بچوں کے کراچی، پاکستان گئے تھے، یہاں پہنچ کر مجھے پتہ چلا کہ یحیی ہاشم باوانی جنہوں نے میری پہلی کتاب مرتب کرنے میں میری مدد کی تھی انتقال کر گئے ہیں۔ زکریا صدیق مجھے تعزیت کے لیے ان کے گھر لے گئے جہاں ہم نے ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ بدقسمتی سے مجھے ان کی آخری کتاب کی کاپی نہیں ملی جو میمن اسکرپٹ پر لکھی تھی، تاہم انہوں نے دستاویز کی ایک کاپی مجھے انتقال سے پہلے فراہم کر دی تھی- یحیی بھائی ایک نہایت ہی مشفق اور مہربان انسان تھے ان کی کمی ہمیشہ رہے گی۔

اسی سفر کے دوران زکریہ صدیق نے مجھے جیت پور میمن ایسوسیشن اسکول کی ایک تقریب میں شرکت کی دعوت دی جہاں مجھے اسکول کے طلبہ اور اساتذہ سے مختصر خطاب کرنے کے لیے کہا گیا۔ میں اپنے ساتھ ۱۹۶۳ کی اپنی سب سے پرانی رپورٹ کارڈ ساتھ لے گیا، جب تقریر کے دوران میں نے

اپنی رپورٹ کارڈ دکھائی تو طلبہ کے ساتھ ساتھ پرنسپل اور اساتذہ بھی بہت حیران اور متاثر ہوئے۔ میں وہ کلاس رومز بھی دیکھنے گیا جہاں میں پڑھا کرتا تھا۔ اسی فنکشن میں میری ملاقات ڈاکٹر سارہ بانو صاحبہ سے ہوئی جو کالسوفٹ کمپنی میں کام کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے اپنی کمپنی میں بھی خطاب کرنے کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی۔

جب ہم چھٹیاں گزار کر واپس آئے تو توصیف اور شرین ہیوسٹن میڈیکل سینٹر میں ایک نہایت عمدہ کنڈومینیم خرید چکے تھے۔ ایک رات ہماری حیرت و خوشی کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے ہمیں اطلاع دی کہ شرین امید سے ہے اور ڈاکٹر نے ۲۶ دسمبر ۲۰۰۷ کے قریب ولادت کی تاریخ دی ہے، یہ خوشخبری توصیف کے والدین کو بھی بتا دی گئی، ہم سب نہایت بے چینی سے نئے مہمان کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔

طارق بھائی اور افشاں بھابھی ۲۰۰۷ کے آخر میں ہیوسٹن پہنچے۔ ہم سب شرین کی دیکھ بھال میں لگے رہے, غیر متوقع طور پر شرین کو ۲۶ دسمبر سے ایک ہفتہ پہلے ہی ہسپتال لے جانا پڑا، میں نے اشرف اور اس کے اہل خانہ کو بھی اطلاع کر دی، انتظار کے لمحے بڑے کٹھن ہوتے ہیں، بہرحال اللہ تعالی نے شرین کو ایک بیٹی ۲۱ دسمبر کو اور ہمیں اپنی پہلی نواسی سے نوازا۔ نواسی کا نام تیشانور رکھا گیا۔ یہ ہماری زندگی کا ایک بہترین لمحہ تھا، ہم اتنے خوش تھے کہ شرین سے پوچھنا ہی بھول گئے کہ وہ کیسا محسوس کر رہی ہے۔

میری والدہ بھی امریکہ آچکی تھیں اور میری بہن عائشہ کے پاس رہ رہی تھیں۔ عایشہ اور میرے ایک بھائی نے ہم سے صرف اس لیے قطع تعلق کر لیا تھا کہ ہم اپنی ماں کو اپنے ساتھ نہیں رکھ پا رہے تھے، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی، انہیں پتہ تھا کہ میری بیوی کے کئی اپریشن ہو چکے ہیں اور وہ کافی بیمار رہتی ہے، اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ میری ماں کی دیکھ بھال کر سکے بلکہ مجھے اور نعمان کو اس کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ بہرحال چونکہ مجھے ماں سے ملنا تھا اس لیے میں بالٹی مور بہن کے گھر جا کر ماں سے مل آیا۔

کچھ عرصے بعد میری والدہ میرے چھوٹے بھائی ابراہیم کے ساتھ رہنے لگیں جو بفلو میں رہتا تھا۔ جب میں ان سے ملنے بفلو گیا تو انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں انہیں واپس پاکستان اپنی چھوٹی بہن یاسمین کے پاس بھیج دوں، انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ امریکہ میں مرنا نہیں چاہتیں۔ انہیں صندوق میں دفن ہونے سے ڈر لگتا تھا۔ وہ اپنی بقیہ زندگی پاکستان میں اپنی بیٹیوں کے ساتھ گزارنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میرا بھتیجہ یعنی ان کا پوتا انہیں کراچی پاکستان چھوڑ آئے گا اگر میں دونوں کے ٹکٹ کے پیسے ادا کر دوں تو۔ انہوں نے مجھ سے اس خدشے کا بھی اظہار کیا کہ کہیں میں ان کی ماہانہ مالی امداد بند تو نہیں کر دوں گا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا میں کبھی بھی اپ کی مالی امداد بند نہیں کروں گا۔ اور نہ ہی کبھی میں نے ایسا کیا۔ بھائی نے بھی بجائے یہ کہ وہ ماں کی مدد کرتا جو کہ وہ کر سکتا تھا سارا الزام میری بیوی کے سر تھوپنے کی کوشش کی کہ وہ میری ماں کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتی۔

اس دنیا کا یہی دستور ہے ہر کوئی اپنے فائدے کی سوچتا ہے ہماری ثقافت آج بھی ہندو ثقافت کی باقیات رکھتی ہے، جس میں یہ رواج ہے کہ بڑا بیٹا ہی اپنے والدین کو اپنے ساتھ رکھے گا۔ اسلام میں نہ تو ایسی کوئی رسم ہے نہ ہی کوئی حکم۔ اسلام میں لڑکے کے ماں باپ کی ذمہ داری بہو پر نہیں ڈالی گئی اور نہ ہی یہ بہوؤں کا کام ہے۔ درحقیقت یہ تمام بہن بھائیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کا ہر طرح سے خیال رکھیں، اور ان کی پوری طرح سے کفالت کریں۔

مجھے یہ سن کر بہت دکھ ہوا جب اپنے اخری دنوں میں میری والدہ نے مجھے بتایا کہ میرے علاوہ کسی بھی بھائی نے ان کی کبھی کوئی مالی مدد نہیں کی۔ وہ انہیں یہ کہتی رہیں کہ میں جو پیسے انہیں بھیجتا ہوں وہ ان کے لیے کافی ہیں۔ لیکن افسوس کہ کسی کو ۵۰ ڈالر بھی بھیجنے کی توفیق نہ ہوئی۔ اگر انہیں ۵۰ ڈالر اضافی بھیج دیے جاتے تو شاید وہ زیادہ بہتر محسوس کرتیں۔ ۵۰ ڈالر کوئی زیادہ رقم نہیں، کون ایسا ہوگا جو اپنے ماں باپ کے لیے ۵۰ ڈالر بھی نہ نکال سکے۔

ہر شخص نے اپنے اپنے عمل کا حساب دینا ہے، میں نے اپنی طرف سے اپنے ماں باپ اور خاندان کی مدد کرنے کی پوری کوشش کی اور نہ ہی کبھی میری بیوی نے مجھے منع کیا۔ اور میں نے یہ کوئی احسان نہیں کیا۔ ہر اولاد کا فرض ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کی خدمت کرے۔ ہر اولاد کو سوچنا چاہیے کہ جب وہ بچے تھے، جب وہ خود سے نہ کھا سکتے تھے نہ پی سکتے تھے، نہ اپنے کپڑے بدل سکتے تھے تو کون یہ سب ان کے لیے کرتا تھا، جب وہ بیمار پڑتے تو کون ان کا علاج معالجہ کرواتا تھا۔

یہ والدین ہی ہیں جو پال پوس کر آپ کو بڑا کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جب بیٹے کی شادی ہو جاتی ہے اور اس کے بال بچے ہو جاتے ہیں تو مالی معاملات میں کچھ مشکل پیش آتی ہے، خاص طور پر جب آمدنی محدود ہو تو، یہی حال میرا تھا، ۳۲ سال کی عمر دو بچے اور محدود آمدنی، لیکن اللہ کے فضل سے جب میں نے اپنے والدین پر خرچ کیا، باقاعدگی سے زکوۃ ادا کی اور حتی المقدور صدقہ خیرات کرتا رہا تو اللہ تعالی نے مجھے اور بھی زیادہ نوازا۔ اگر اپ اپنے فرائض ادا کرتے رہیں تو اللہ تعالی اپ کو اور بھی زیادہ نوازتا ہے۔

۲۰۰۹ کی عید الفطر ہم نے اپنے قریبی خاندان کے ساتھ نہایت خوشگوار طریقے سے منائی۔ ہر سال کی طرح میرا بھائی اشرف اور اس کا خاندان بھی ہمارے ساتھ تھا۔ یاسمین کے گھٹنوں کی سرجری کی وجہ سے ہم خاندان سے باہر کے لوگوں کو نہیں بلا سکے اور نہ ہی دوسروں کے ہاں دعوتوں میں جا سکے۔

سنہ ۲۰۱۰ ہمارے لیے مشکل ثابت ہوا، نعمان نے علیحدہ رہنے کا فیصلہ کر لیا، اسے زندگی میں بہت سے چیلنجز کا سامنا تھا۔ میرے اور یاسمین کے لیے یہ بات کسی صدمے سے کم نہ تھی۔ ہم نے ہمیشہ اپنے اور اپنے بچوں کے لیے اللہ سے ہدایت ہی مانگی ہے۔ یہ واقعات میں سچے دل سے قلم بند کر رہا ہوں اس امید پر کہ آنے والی نسلیں اس سے استفادہ حاصل کر سکیں۔

ہر خاندان کے اپنے مسائل ہوتے ہیں لیکن شاد و نادر ہی کسی میں ہمت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کی رہنمائی کے لیے ان کا ذکر کرے۔ ہمارے خاندان کی بھی اپنی مشکلات تھیں۔ لیکن میں کبھی بھی اللہ کا شکر پوری طرح سے ادا نہیں کر سکوں گا کہ جو کچھ اس نے ہمیں دیا، ہمیں اور ہمارے بچوں کو

جو خوشگوار زندگی عطا کی وہ صرف اور صرف اسی کی عنایت ہے۔ اللہ تعالی خوشیاں دے کر بھی امتحان لیتا ہے اور مشکلات میں ڈال کر بھی امتحان لیتا ہے۔

پیپر: ہمارے میڈیکل ڈائریکٹر ڈاکٹر جان رگس، ہمارے کام سے کافی متاثر تھے کہ کس طرح ہم نے سسٹمز کے تمام نتائج کو یکجا کیا اور کس طرح ساتھ ساتھ ان کی تصاویر کو بھی EPIC ریکارڈز اپلیکیشن میں ڈسپلے کیا۔ ہم دونوں نے اپنے اس کام پر ایک مقالہ لکھنے اور اسے اگلی کانفرنس میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے پیپر اور پریزنٹیشن تیار کی جب کہ انہوں نے اس کی ایڈیٹنگ وغیرہ۔ پیپر منظور ہونے کے بعد ڈاکٹر رگز نے مقالہ پیش کیا جبکہ میں نے تمام تکنیکی سوالات کے جواب دیے۔ اس سے مقالے کو کانفرنس میں کافی سراہا گیا۔ جولائی ۲۰۱۳ میں ہیرس ہیلتھ سسٹم کو ہیلتھ کیئر کے سب سے زیادہ وائرڈونرز ۲۰۱۳ سے نوازہ گیا۔ میں نے اپنے CIO کے ساتھ اس تقریب میں شرکت کی۔ یہ ایوارڈ میری ریٹائرمنٹ پر مجھے تحفے کے طور پر دے دیا گیا، جو اب میرے ہوم افس کی زینت ہے۔

کارڈیک سرجری نومبر ۲۰۱۳

۱۹۸۵ سے میں نے اور یاسمین نے روزانہ شام کو چہل قدمی کرنا شروع کر دی تھی- ہمارا خیال تھا کہ ہماری صحت اچھی رہے - ۲۰۱۳ کے اوائل میں اچانک ایک دن یاسمین کو بائیں بازو ن میں درد سا محسوس ہونے لگا۔ ہم نے کئی ماہر امراض قلب کو دکھایا۔ آہستہ آہستہ درد کے دورے اور شدت بڑھنے لگی، ڈاکٹروں نے مختلف ٹیسٹ کروائے مثلا ای سی جی، ای کے جی، ایکو، ٹریڈ مل اور نیوکلیئر ایم ار ائی ٹیسٹ وغیرہ لیکن مرض کی تشخیص نہیں ہو پا رہی تھی۔ یاسمین نے بھی ہمت نہیں ہاری وہ

بھی مرض کی تہہ تک پہنچنا چاہتی تھی۔ آخر کار ماہر امراض قلب نے کیلشیم اسکور ٹیسٹ کروانے کا مشورہ دیا جس نے اپنا کام کر دکھایا۔ پتہ چلا کہ قلب کی مرکزی شریان ۹۸ فیصد بند ہے جبکہ دوسری شریان تقریبا ۸۰ فیصد بند تھی۔ ڈاکٹرز نے روبوٹک کارڈیک سرجری کی تجویز دی اور فورا ہی وقت شیڈیول کر دیا۔ اس سرجری میں زیادہ کاٹ پیٹ کی ضرورت نہیں پڑتی، زخم بھی گہرے نہیں آتے اور اور انسان جلد صحت یاب ہو جاتا ہے۔

نومبر ۱۸، ۲۰۱۳ سرجری کے دن ہم میتھوڈسٹ ہسپتال، میڈیکل سینٹر پہنچ گئے جہاں ایک بہترین ماہر امراض قلب کے سرجن نے کوئی چھ گھنٹے میں یاسمین کی سرجری مکمل کی، سرجری میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ ائی اور یاسمین کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا۔ میں شام کو گھر واپس آگیا اور رات کا کھانا کھا کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ دوسرے دن صبح اٹھ کر جب میں ہسپتال جانے کی تیاری کر رہا تھا تو اچانک سے ہسپتال سے کال آگئی، میں نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے مجھے یاسمین کے سرجن کی گھبرائی ہوئی اواز سنائی دی، اس نے بتایا کہ یاسمین کے ای کے جی کی رپورٹ کچھ ٹھیک نہیں اور وہ اسے چیک کرنے کے لیے دوبارہ اپریشن تھیٹر لے جا رہے ہیں تاکہ اس خرابی کی وجہ جان سکیں۔

میں فورا ہی ہسپتال کے لیے روانہ ہو گیا، جیسے ہی ہسپتال کی دوسری منزل پر لفٹ سے باہر نکلا، سامنے ہی یاسمین کا سرجن ایک اور ڈاکٹر کے ساتھ کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ روبوٹک سرجری تو کامیابی سے ہو گئی تھی لیکن ایک بائی پاس والی شریان کا قریب سے گزرنے والی ایک اور شریان کہ ایک حصے پر دباؤ بہت زیادہ پڑ رہا ہے جس کی وجہ سے انہیں اوپن ہارٹ سرجری کرنا پڑے گی۔

یاسمین ابھی تک بے ہوش کرنے والی ادویات کے زیر اثر تھی، لیکن جب ڈاکٹر نے اسے تمام چیزیں سمجھائیں تو وہ سرجری پر آمادہ ہو گئی، اور راضی نامہ پر دستخط کر دیے۔ شرین اور توصیف سارا وقت میری مدد کے لیے میرے ساتھ رہے، باقی خاندان والوں نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر کوئی خاص ساتھ نہ دیا۔ بہرحال اوپن ہارٹ سرجری نہایت کامیابی سے اپنے اختتام کو پہنچی اور ڈاکٹروں نے بھی اطمینان کا اظہار کیا۔ پانچ دن بعد ڈاکٹروں نے یاسمین کو ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا اور وہ گھر آگئی آنے والے ایام کافی صبر ازما تھے، میں نے یاسمین کی تیمارداری میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یاسمین کی بہن حوا ما کو امریکہ کا وزٹ ویزا مل گیا، میں نے ٹکٹ بھیج کر اسے بھی بلا لیا تاکہ وہ بھی ہمارا کچھ ہاتھ بٹا سکے۔

دو دن کے اندر ہی یاسمین کی بہن امریکہ پہنچ گئی، اسی درمیان میں نے اور یاسمین نے طے کیا کہ اب چونکہ میری سالی اگئی ہے تو میں آفس جانا شروع کر سکتا ہوں، جب تک وہ امریکہ میں ہے اس کے جانے کے بعد میں دو ہفتے کی اور چھٹی لے لوں گا۔ یاسمین اپنی زندگی میں کئی سرجریز سے گزری لیکن اس نے ہمت نہ ہاری، میرا خیال ہے اس سرجری کے بعد یاسمین کی بس ہو چکی تھی، شاید اب اس میں مزید قدرتی آزمائشوں سے گزرنے کی ہمت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ یاسمین کی صحت آہستہ آہستہ بہتر ہوتی گئی، اس سانحے کو گزرے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا۔ ماشاءاللہ سے اب وہ ٹھیک ہے اور ہم پھر سے روزانہ شام کو ٹہلنے جاتے ہیں۔

تابش کی پیدائش نومبر ۸، ۲۰۱۵

شرمین اور توصیف کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا جب مئی ۲۰۱۵ میں انہوں نے اپنے خاندان میں ایک نئے آنے والے کا اعلان کیا، جس کی متوقع آمد جنوری ۲۰۱۶ بتائی گئی تھی۔ شرمین نے اپنے کام کاج کے ساتھ نئے انے والے کی تیاری بھی شروع کر دی۔ اکتوبر کے اخر میں شرمین کی ڈاکٹر نے اسے بچے کی پیدائش میں کچھ پیچیدگیوں کے بارے میں بتایا اور اس خدشے کا بھی اظہار کیا کہ بچے کی پیدائش وقت سے پہلے بھی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر کی یہ بات صحیح ثابت ہوئی اور تابش ابان صاحب ۸ نومبر ۲۰۱۵ کو ہی دنیا میں تشریف لے آئے۔ ایک منحنی، کمزور سا لڑکا لیکن جینے کی طاقت سے بھرپور جسے پانچ جنوری ۲۰۱۶ تک ہسپتال میں رہنا پڑا۔ اتفاق سے جس دن تابش گھر آیا وہ دن میری سالگرہ کا دن بھی تھا۔ نواسے کے گھر آنے پر ہم سب بہت خوش ہوئے۔

۲۰۱۵ کے اخر میں میں نے اپنے مینیجر کو اطلاع کر دی کہ شاید دسمبر ۲۰۱۶ تک میں ریٹائرمنٹ لے لوں گا۔ ہم سال ۲۰۱۴ میں پاکستان اور سعودی عرب کا سفر کر کے آ چکے تھے اور نومبر ۲۰۱۶ میں عمرہ کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اپنی زیادہ سے زیادہ چھٹیاں استعمال کر لوں، اس لیے کہ ہیرس کمپنی ریٹائرمنٹ یا چھوڑ کر جانے والوں کو صرف ادھی چھٹیوں کی تنخواہ دیتے تھے۔ میں نے اپنی والدہ سے بھی وعدہ کر لیا تھا کہ ریٹائرمنٹ لیتے ہی دسمبر۲۰۱۶ میں، میں ان سے ملنے پاکستان آؤں گا۔

ہمارا نومبر ۲۰۱۶ میں سعودی عرب کا سفر نہایت خوشگوار رہا، اس دوران میں نے اپنے کچھ پرانے کنگ فیصل ہسپتال کے ساتھیوں کے ساتھ بھی وقت گزارا. یہ ہسپتال میں اور ۱۹۹۸ والا اسپتال

جسے میں چھوڑ کر گیا تھا ان دونوں میں زمین اسمان کا فرق پڑ چکا تھا، کئی نئی نئی بلڈنگیں اور ڈیپارٹمنٹس بن چکے تھے۔ جو ریسرچ سینٹر میں چھوڑ کر گیا تھا اب یہ اس سے کوئی چار گنا بڑا ہو چکا تھا۔ میری ملاقات اپنے پرانے سی ائی او حماد الدائگ اور اپنے پسندیدہ ماتحت عامر الراشد سے بہت اچھی رہی۔ ان دونوں نے وقت سے پہلے ہی ریٹائرمنٹ لے لی تھی. سعودیوں کے لیے قانون ہے کہ وہ چاہیں تو ۲۰ سال کی مدت ملازمت پوری کر کے ریٹائرمنٹ لے سکتے ہیں۔

دو ہفتے کیسے گزرے پتہ ہی نہیں چلا، ہم واپس ہیوسٹن آ گئے، ادھر میرا باس ڈیوڈ لیمن اور دوسرے ساتھی میری ریٹائرمنٹ پارٹی کی تیاری میں لگے ہوئے تھے انہوں نے مجھے پارٹی میں بیوی بچوں کو بھی ساتھ لانے کی درخواست کی۔ بروز جمعرات آٹھ دسمبر ۲۰۱۶ کی تاریخ طے ہوئی، تاکہ تمام لوگ اسانی سے شرکت کر سکیں۔ پارٹی والے دن جب ہم انتظامی افس کے کیفٹیریا جو پارٹی کے لیے بک کیا گیا تھا پہنچے تو میں حیران رہ گیا کہ اتنے سارے لوگوں کو بلایا گیا ہے۔ ہمارے اعزاز میں چند تقاریر ہوئیں اور اس کے بعد عشائیہ لگا دیا گیا۔ میں نے اپنے تمام ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا۔ میں ان کا بہت مشکور ہوں کہ انہوں نے ہمارے لیے الگ سے حلال کھانے کا انتظام کیا۔ میں پہلے سے ہی اپنے سی آئی او، ٹم ٹنڈل اپنے باس ڈیوڈ لیمن اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے لیے کچھ تحائف لے گیا تھا۔ سب کو تحائف بہت پسند آئے، سب بہت خوش ہوئے۔

ہم ۲۵ جنوری، ۲۰۱۷ کو پاکستان کے لیے روانہ ہوئے، پیچھے میں گھر خالی رہنے کی وجہ سے میں نے سیکوریٹی کے انتظامات مکمل کر لیے تھے، دیگر ماہانہ اخراجات کو آٹوپیمنٹ پر سیٹ کر دیا اور محلہ کی

نگہبانی کرنے والی پولیس کو بھی اطلاع کر دی تا کہ گھر محفوظ رہ سکے۔ کراچی پہنچنے پر ہمیشہ کی طرح موسم خوشگوار تھا۔ اس ٹرپ کے دوران ہمارے دو مقاصد تھے ایک تو میں نے چونکہ ماں سے وعدہ کیا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد ان سے ملنے آؤں گا، دوسرے ہمارے کراچی والے گھر کی حالت ستائیس سال کے عرصہ میں کچھ مخدوش ہو چکی تھی اسے بھی ٹھیک کروانا تھا۔ میرا بہنوئی اقبال جب ہیوسٹن آیا تھا تو اس نے گھر کی تزئین و آرائش میں میری مدد کرنے کا پہلے ہی وعدہ کر لیا تھا۔ اگلے آٹھ ہفتے گھر کی مرمت وغیرہ کرنے اور ماں سے ملنے میں گزر گئے۔ جب بھی میں ماں سے ملنے جاتا تو وہ مجھ سے ہمیشہ یہی کہتیں کہ میں تیرا ہی انتظار کر رہی تھی، کیا تو نے کچھ کھایا، کیا بات ہے تو کچھ کمزور لگ رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ میری والدہ کو غریق رحمت کرے، ہم سب بہن بھائیوں سے انکی بے تحاشہ محبت میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

اس دوران میں نے پہلی بار اپنی بہن یاسمین کو بتایا کے اب میں ریٹائر ہو چکا ہوں اور جو رقم میں اسے ماہانہ بھیجتا تھا اب میرے لیے بھیجنا ممکن نہیں، یہ سال کے چھ ہزار ڈآلر بنتے تھے، پانچ سو ڈالر مہینہ کے حساب سے۔ میں نے اسے سال ۲۰۱۷ کے اخراجات کے لیے پانچ ہزار ڈالر دیے اور دونوں بہنوں، یاسمین اور محمودہ کو تاکید کی کہ انہیں احتیاط سے خرچ کریں، بلکہ بہتر ہو گا کہ ہر مہینے کا ایک بجٹ بنا لیں اور اسی حساب سے خرچ کیا کریں۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہماری ماں صرف چار مہینے کی مہمان ہے۔

ان دو ماہ میں میرے لیے ماں سے ملنا ایک نعمت تھا، میری والدہ ہر سال خاندان کے تمام بچوں میں عیدی بانٹتی تھیں، انہوں نے مجھ سے بھی وعدہ لیا کہ ان کے بعد میں بھی ہر سال اسی طرح سے خاندان کے تمام بچوں کو عیدی دیا کروں۔ میری بہن یاسمین نے میری طرف سے یہ ذمہ داری قبول کرلی اور اسی فنڈ سے عیدی دینے پر تیار ہو گئی۔ ایک اور بات جو میری والدہ نے مجھے اور یاسمین سے خاص طور پر کی وہ یہ کہ ہم فکر نہ کریں نعمان ٹھیک ہو جائے گا اور انشاء اللہ جلد ہی شادی کرلے گا اور میں ایک بار پھر اپنے بیٹے پر فخر کر سکوں گا۔

وہ ایک انتہائی بہادر خاتون تھیں، ہم سب کی دیکھ بھال کرتیں، دن میں تین وقت کا کھانا پکانا، سب کا خیال رکھنا، اکثر ہمیں کھانا کھلانے کے لیے اپنا کھانا چھوڑ دیتیں۔ دس بچوں کے ہوتے ہوئے سب کا ایک جیسا خیال رکھنا کوئی آسان کام نہیں، کبھی نہ کبھی کوئی تو نظر انداز ہو ہی جاتا ہے۔ اس بات سے بھی وہ کچھ پریشان تھیں اور مجھ سے کہا کرتیں کہ مجھے تم سب بہن بھائیوں سے بہت محبت ہے، میں نے کبھی کسی کو جانتے بوجھتے نظر انداز نہیں کیا، لیکن پھر بھی اگر کہیں کوئی کوتاہی ہو گئی ہو تو سب سے کہنا کہ مجھے معاف کر دیں اور میرے بعد میرے لیے مغفرت کی دعا کرتے رہیں۔ انہوں نے مجھ سے ذاتی طور پر منور کے لیے بھی معافی مانگی۔

میں نے حتی المقدور کوشش کی کہ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گذار سکوں۔ میں اور یاسمین انہیں بتائے بغیر کراچی پہنچ گئے تھے، صرف میری بہن یاسمین کو پتہ تھا۔ ہم انہیں سرپرائیز دینا چاہتے تھے۔ جس دن ہم کراچی پہنچے اس دن میری بہن محمودہ کے بیٹے ابراہیم کا ولیمہ بھی تھا، ہم سیدھے شادی

حال پہنچ گئے، ماں ہمیں دیکھ کر نہ صرف بہت حیران ہوئی بلکہ اسکی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ بد قسمتی سے دو تین دن بعد آدھی رات کے قریب ماں کچھ کرنے کے لیے اٹھی لیکن سنبھل نہ سکی اور گر گئی، گرنے سے اسکا بایاں گھٹنا زخمی ہو گیا، کئی سال پہلے اسکی دائیں ٹانگ میں بھی چوٹ لگ چکی تھی۔ ایسی ہی چوٹ اقبال موتی کی والدہ کو بھی لگی تھی، اس لیے ہم نے بہتر سمجھا کہ اسی ڈاکٹر سے رابطہ کیا جائے جس نے اقبال موتی کی والدہ کا علاج کیا تھا۔

والدہ کے ایکسرے کے لیے بلیو کراس ایکسرے اور لیب والوں سے گھر پر ہی پورٹیبل ایکسرے مشین سے ایکسرے نکلوا لیے، ایکسرے سے پتہ چلا کہ آخری سرجری کے بعد سے پہلی چوٹ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی تھی اور اب بائیں فیمر، گھٹنے کے قریب سے کچل گیا تھا۔ انکا آسٹیوپورسس، جو ہڈیوں کے بھربھرے پن کی بیماری ہوتی ہے، وہ بھی کافی حد تک بڑھ چکی تھی، اس لیے ڈاکٹروں کے مطابق انکی مزید سرجری کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ ویسے انکے باقی لیبارٹری ٹیسٹس کافی حد تک نارمل تھے۔

ایک دن میں اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت کر رہا تھا تو بائی بھی اپنی بیٹیوں عظمیٰ اور حنا کے ساتھ ماں سے ملنے آ گئی۔ میں نے حنا کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ لیاقت نیشنل ہسپتال کی ریذیڈنٹ فزیشین ہے۔ یہ جاننے کے بعد میں نے اس سے متبادل رائے جاننے کے لیے ماں کے ایکسرے اور دوسری رپورٹس وغیرہ دکھائیں، اس کی بھی یہی رائے تھی کہ ایسی حالت میں سرجری کروانا بہت مشکل ہے۔ اس کے بعد سے حنا اکثر ماں کو دیکھنے آجاتی، بلکہ ماں کے دائیں پائوں سے خشک گینگرین نکالنے کے لیے اس نے ایک سرجن کا بھی انتظام کروا دیا تھا۔ جب

تک سرجن اپنا کام کرتا، میں تسلی کے لیے ماں کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ میں ڈاکٹر حنا کا بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے میری والدہ کے علاج پر بھرپور توجہ دی۔

ایک دفعہ میں اپنے بی ایم بی اسکول کی کلاس کے ایک ساتھی اور دوست الیاس احمد کے ساتھ صبح فجر کی نماز کے بعد کراچی کی سیر کے لیے نکل گیا، ہم ایمپریس مارکیٹ کے قریب اپنے پرانے اسکول بی ایم بی کے راستے سے ہوتے ہوئے، فریر روڈ، جے ایم اے اسکول، جمیل میمن کا گھر، رتن تالاب، جہاں اشرف مجید کا گھر ہوتا تھا، میری نانی کا گھر، اردو بازار اور ویمن کالج سے ہوتے ہوئے حاجرہ بائی منزل، جہاں سلیم چھاپرا کا گھر ہوتا تھا، جہاں بچپن میں ہم کھیلتے تھے، برنس روڈ، فاروق حبیب اور الیاس کے گھر پہنچ گئے، یہاں سے نکل کر ہم سعید منزل کی طرف، جوبلی سینیما اور رنچھوڑ لائن سے گزرے۔ یہ ایک حسین صبح تھی، ہم دونوں ۱۹۶۰ کی دھائی میں پہنچ چکے تھے، گو کہ کراچی بہت بدل چکا تھا، لیکن علاقے تو وہی جانے پہچانے تھے جہاں ہم نے اپنا بچپن بتایا تھا۔ جوبلی سینیما پر رک کر ہم نے کئی تصویریں بنائیں۔ ہمارا اگلا پڑاؤ کراچی کی مشہور ہوتی مارکیٹ تھا۔ گاڑی پارک کر کے جب ہم ہوتی مارکیٹ میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ مارکیٹ کافی مخدوش حالت میں تھی، لگتا ایسا تھا کے شہر کے حکام کو ایسے مشہور مقامات محفوظ رکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ کونے پر حجام کی دوکان اب بھی ویسی ہی تھی جہاں میرے والد ہمیں بال کٹوانے کے لیے لے جاتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس وقت چھت پر پنکھے لگے ہوتے تھے اب دوکان میں اے سی لگ گیا تھا۔

یہیں سے وہ گلی شروع ہوتی تھی جو ہمارے سب سے پرانے گھر کو جاتی تھی، یہ وہ گلی تھی جہاں سے روزآنہ بلا ناغہ بچپن میں ہمارا نہ جانے کتنی دفعہ آنا جانا ہوتا تھا، غذدر آباد کی گلی۔ جب میں اس عمارت کے قریب پہنچا جہاں ہم رہتے تھے، میرے اندر ماضی کا چھوٹا سا بچہ جاگ گیا، میں ماضی میں پہنچ چکا تھا، میری آنکھوں کے سامنے مختلف مناظر گھوم رہے تھے۔ میں چھلانگ لگا کر نہایت تیزی سے عمارت کے دروازے سے اوپر جانے لگا جیسے میں بچپن میں جاتا تھا، الیاس پیچھے رہ گیا تھا، چند لمحوں کے لیے مجھے اپنے تمام نو بہن بھائی چیختے چلاتے، کھیلتے کودتے ہوئے نظر آنے لگے۔ مین دروازہ بند تھا، میں نے دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا، روٹی یا کھانا پکانے کی کوئی بو نہ تھی جس سے آپ کو پتہ چل سکے کہ کیا پک رہا ہے یا پکایا گیا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، افسوس میرا استقبال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ میرا خواب اس وقت ٹوٹا جب الیاس نے مجھ سے کہا کہ کیوں نہ کچھ تصوریں لے لی جائیں۔ میں نے اپنے ماضی کو یاد رکھنے کے لیے ایک سیلفی بنائی۔ انسان کو اپنا ماضی کبھی نہیں بھولنا چاہیے بلکہ اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے، خواب دیکھیں، کچھ ناممکن نہیں، خواب ہی حقیقت میں بدلتے ہیں۔ مسلسل محنت، لگن اور جد و جہد خوابوں کو حقیقت میں بدل سکتے ہیں۔

۲۱ مارچ ۲۰۱۷ کو ہم ہیوسٹن واپس آکر اپنے روزمرّہ کے معمولات میں مصروف ہو گئے۔ چند ہفتوں بعد یکم مئی ۲۰۱۷ کو صبح سویرے میرے بہنوئی اقبال موتی کا فون آیا جو مجھے میری ماں کے انتقال پر تعزیت کر رہا تھا، مجھے سمجھ نہیں آیا کہ کیا ہوا، پھر مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو کسی نے ماں کے انتقال کی اطلاع دی ہی نہیں، میں نے فوراً اپنی بہن محمودہ کو فون کیا تو اس نے اس خبر کی تصدیق کر دی۔ اس صبح ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ محمودہ نے بتایا کہ جنازہ تیار ہے اور تھوڑی ہی دیر میں نماز جنازہ کے لیے

مسجد لے کر جائیں گے۔ میں نے اپنی دوسری بہن یاسمین سے بھی بات کی، پھر تمام بہن بھائیوں کو اطلاع دینے کے لیے فون کیے، لیکن ان سب کو پہلے ہی علم ہو چکا تھا۔ ماں کے انتقال سے ایک رات پہلے میں نے ان کے ساتھ ویڈیو کانفرنس کی تھی، اس وقت روف ماما کے ساتھ سب بہنیں بھی وہاں موجود تھیں۔ امی کو شام کے کھانے کے لیے انکا شیک دیا گیا۔ وہ تمام کلمات پڑھ چکی تھیں اور سونے سے پہلے ان کے کان میں یٰس کا ورد بھی ہو چکا تھا۔

ماں کی نگہداشت کرنے والی خاتون سعیدہ ایک شاندار خاتون تھیں، ۲۴ گھنٹے انکی دیکھ بھال کرتیں، ماں نے رات تین بجے کے قریب اٹھ کر پانی مانگا اور پھر پانی پی کر سو گئی۔ صبح نو بجے کے قریب جب سعیدہ نے ماں کا ناشتہ تیار کر کے اسے جگانے کی کوشش کی تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا، چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر کو گھر بلایا۔ ڈاکٹر نے پہلی مئی ۲۰۱۷ کو صبح ساڑھے نو بجے ماں کا معائنہ کرنے کے بعد اس بات کی تصدیق کر دی کے ماں کا انتقال تین چار گھنٹے پہلے ہی ہو گیا تھا، اس لحاظ سے انکا انتقال تقریباً صبح چھ سے ساڑھے چھ کے درمیان نماز فجر کے قریب ہوا ہو گا۔

اگلے دن نعمان اپنی بیماری اور کام سے نکالے جانے کے بعد گھر آگیا۔ وہ دوبارہ ایک خوشگوار زندگی کا سفر طے کرنا چاہتا تھا۔ میں اور یاسمین اس کی ہر طرح سے مدد کر رہے تھے۔ ہم نے محسوس کیا کے اسکا وزن کچھ کم ہو گیا ہے۔ ہم نے اسے اس کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے کہ مرض کی صحیح معنوں میں تشخیص ہو سکے۔ ڈاکٹر نے ہمیں بتایا کہ نعمان شدید ذیابطس کا شکار ہے اور یہ اپنے کھانے پینے کا خیال نہیں رکھتا، اسکے پی سی پی نے ہمیں ایک جی آئی ماہر کے پاس بھیج دیا۔ جی آئی ماہر نے پیٹ کے ایم

آر آئی سمیت کئی اور ٹیسٹس کروائے جنکے نتائج نہایت ھولناک نکلے۔ نعمان کا لبلبہ کافی خراب ہو چکا تھا جسکی وجہ سے جسم میں انسولین بننا تقریباً بند ہو چکی تھی اور باہر سے جو انسولین دی جا رہی تھی وہ بھی صحیح کام نہیں کر پا رہی تھی، اسکے نتیجے میں لبلبے میں سوزش بڑھ گئی تھی جسکی وجہ سے نعمان کو پیٹ میں درد کی شکایت ہوتی تھی۔ کچھ مہینوں بعد جی آئی کے ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ لبلبے میں اسٹنیٹ ڈآل دیا جائے، اسٹینٹ ڈالنے کے لیے بھی لبلبے میں جگہ بہت کم رہ گئی تھی اس لیے کہ لبلبے کی زیادہ تر نالیاں بند ہو چکی تھیں۔

نعمان ہمارے ساتھ صرف چھے مہینے گزار سکا اور صرف ۳۴ سال کی عمر میں ۲۴ اکتوبر ۲۰۱۷ کی رات سوتے میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ جب میں نے جئی آئ سے بات کی تھی تو اس نے بتایا کے نعمان شدید درد کی کیفیت میں رہتا تھا، لیکن اس نے ہم سے کبھی شکایت نہیں کی اور ہر دن یہ سوچ کر گزارتا کہ اگلا دن بہتر ہو گا۔ اللہ کی یہی مرضی تھی، اللہ نے شاید اسے مزید تکلیف سے بچا لیا۔ اب وہ ایک بہت بہتر جگہ پر ہے جہاں اسے دنیاوی معاملات کی کوئی فکر نہیں کرنا پڑتی۔ وہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔ ہمیں زندگی بھر اسکی کمی محسوس ہو گی، یہ ایسا غم ہے جو ہم اپنے دلوں سے کبھی مٹا نہیں سکتے۔ اللہ تعلیٰ اسکے تمام گناہ معاف فرمائے اور اسے جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین۔

نعمان ایک متجسس، زندہ دل، خوبصورت، تعلیم یافتہ اور ذہین لڑکا تھا، ہر ایک سے پیار و محبت سے پیش آنے والا، جب وہ بات کرتا تو ہر طرف روشنیاں بکھر جاتی تھیں، اسکی موجودگی سے کمرہ روشن ہو جاتا، دلوں کو لبھانے والا، ہنستہ کھیلتا ایک نوجوان۔ اسے کتابوں سے بہت شغف تھا، خاص طور پر کھانا

بنانے اور جامع زندگی گزارنے والی کتابوں کا بہت شوقین تھا۔ اسکے پاس دو پالتو کتے بھی تھے جن سے اسے بہت محبت تھی، ان کی تربیت و دیکھ بھال میں کافی وقت گزارتا تھا۔ یہ نعمان کی کہانی ہے، میری آپ سے گزارش ہے کہ اسے اپنے پیاروں سے بھی شیئر کریں۔

نعمان کو ہر وہ چیز میسر تھی جو ایک بچے کو چاہیے ہوتی ہے۔ ہم محنتی والدین ہیں، ہم نے اپنے بچوں کی اپنی حد تک تمام اسلامی اخلاق، اقدار اور شعائر کے ساتھ پرورش کی۔ ہم کوئی جدی پشتی امیر نہیں، ہم نے جو کچھ حاصل کیا اپنی محنت، لگن، جدوجہد اور اللہ کی مدد سے حاصل کیا۔ نعمان نے سولہ سال کی عمر سے کام شروع کر دیا تھا اس لیے نہیں کے اسے کام کی ضرورت تھی بلکہ وہ اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ اسے اپنے انتقال کے دن تک کسی دوسرے کے سہارے کی ضرورت نہیں پڑی۔ نعمان کی عمر صرف دو سال تھی جب اس نے ہمارے ساتھ عمرے کا آغاز کیا تھا اور اسکے بعد اس نے کئی بار ہمارے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کی۔ رمضان کے مہینے زیادہ تر ہم اپنے والدین کے ساتھ کراچی میں گزارتے تھے۔ ہم نے دنیا کے کوئی چالیس ممالک کی سیاحت کی، جہاں بھی ہم جاتے نعمان ہمارے ساتھ ہوتا، اسے بھی غیر ممالک کی سیر کرنے میں بہت مزہ آتا اور خوب تصاویر اور ویڈیوز بناتا۔

وہ ہمیں بہت محبوب تھا۔ ہماری طرح اور بھی کئی والدین ہیں جو اپنی جوان اولادوں کو کھو چکے ہوں گے، ایسا کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے، اللہ کی مرضی کے آگے کسی کی نہیں چلتی، اللہ سب کی حفاظت کرے اور سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

۱۰ نومبر ۲۰۱۷ میں ہی ہماری بہن حسینہ کے بیٹے صمیر کا ایک گاڑی کے ایکسیڈنٹ میں کراچی میں انتقال ہو گیا - ۳۱ اگست ۲۰۲۱ میں ہمارے سب سے چھوٹے ماموں رؤف کا اور ۳۱ جنوری ۲۰۲۴ میں بہن عائشہ کا بھی انتقال ہو گیا - اللہ ان سب کی مغفرت کرے اور ان سب کو جنت الفردوس میں جگہ دے - آمین

میں آپ سے امید کرتا ہوں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اسے آپ نے کھلے ذہن کے ساتھ پڑھا ہو گا۔ انسانوں سے غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں، اللہ دے کر بھی آزماتا ہے اور لے کر بھی آزماتا ہے۔ انسان کو ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔ جو لوگ اللہ کے سامنے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے اور توبہ کرتے ہیں امید ہے کہ اللہ نہ صرف انہیں معاف کرے گا بلکہ اس کا اجر و ثواب بھی دے گا۔ میرا مقصد اپنی پوری زندگی کی روئیداد اور تجربات کو آپ کے سامنے حق و سچائی کے ساتھ بیان کرنا تھا تا کہ آنے والی نسلیں اپنے بڑے اور بزرگوں کے تجربات اور ان کی غلطیوں سے سبق حاصل کر کے اپنی اصلاح کر سکیں۔

آخر میں، میں اپنے بیوی بچوں کا بھی بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے زندگی بھر میرا بھرپور ساتھ دیا، اور اس کتاب کے لکھنے میں بھی میری رہنمائی کی۔

باب ۹

ہمارے ابا جان کی سوانح حیات انہیں کی زبانی

میرے والد محمد عبدالکریم موٹن کا انٹرویو میمن مصنفین میں سے ان کے ایک دوست یحییٰ ہاشم باوانی نے کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد انہوں نے مجھے انٹرویو کی ایک کاپی کیسٹ پر دی۔ کیسٹ سنتے ہی والد صاحب سے وابستہ تمام یادیں واپس آگئیں ۔ میں نے مناسب سمجھا کہ انٹرویو کا استعمال کرتے ہوئے ایک مختصر باب ان کی سرگزشت کے لیے بھی وقف کردوں جو انہوں نے مجھ سے شیئر کی تھیں۔ میں ان کی زندگی کی کہانی انہیں کی زبانی نقل کروں گا جیسے وہ خود اپنی سوانح حیات لکھ رہے ہوں

میں اٹھ فروری ۱۹۲۸ کو جیت پور انڈیا میں عبدالکریم موٹن اور عائشہ باوانی کے ہاں پیدا ہوا، میرے بہن بھائیوں میں مجھ سے بڑے غلام احمد جان ،رابعہ اور عثمان مجھ سے چھوٹی ایک بہن حلیمہ ہے۔ حلیمہ کے بعد ایک اور بھائی عمر کی پیدائش ہوئی تھی لیکن وہ بچپن میں ہی فوت ہو گیا۔ میرے بڑے بھائی غلام احمد جان زندگی کے پہلے ہی سال میں بیماری کی وجہ سے بولنے اور سننے سے معذور

ہو چکے تھے۔ میری والدہ عائشہ باوانی میرے والد کی تیسری بیوی تھیں، پہلی بیوی کے دو بچے موسی اور حنیفہ تھے جبکہ ان کی دوسری بیوی بچے کی پیدائش کے دوران فوت ہو گئیں تھیں۔

میری بڑی بہن رابعہ جسے ہم بائی کہتے تھے شادی شدہ تھی اور رنگون میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ اس وقت میری عمر ۱۲ سال تھی، مجھے اپنی امی کی بہت یاد آتی تھی، ایک سال پہلے ہی وہ ٹی بی کے مرض کی وجہ سے اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ ان کے داہنے ہاتھ پہ شدید خارش تھی جس کی وجہ سے زخم سا پڑ گیا تھا۔ میں روز شام کو اسے صاف کرنے میں ان کی مدد کرتا ۔ ایک دن میں زخم صاف کر رہا تھا تو ماں نے مجھے پانی لانے کو کہا، جب میں پانی کا گلاس ہاتھ میں لے کر واپس آیا تو وہ نیچے گری ہوئیں تھیں - میں چیخنے لگا، میری چیخیں سن کر میرے والد بھاگے ہوئے آئے انھوں نے ان کی نبض چیک کی اور کہا کہ ہم تمھاری امی دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔

مجھے اپنی پڑھائی کی بہت فکر تھی۔ میری بہن بھی فکر مند تھیں۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس جماعت میں ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں پہلی جماعت میں ہوں، یہ سن کر وہ تھوڑی سی پریشان ہو گئیں اور کہا کہ میں پڑھائی میں بہت پیچھے ہوں۔ بہن نے میرے والد سے کہا کہ مجھے راجکوٹ کے بورڈنگ اسکول بھیج دیں تاکہ میری تعلیم بہتر ہو سکے

مجھے پہلی جماعت میں راجکوٹ کے شورستر پرائمری اور ہائی اسکول میں داخل کروا دیا گیا، اور میں بورڈنگ اسکول میں رہنے چلا گیا۔ میں ایک بہترین طالب علم ثابت ہوا اور پہلی مرتبہ جماعت میں اول آیا۔ ہمارے جسمانی تعلیم کے استاد اسماعیل گل اور ڈرل ماسٹر فیض محمد تھے۔ اسماعیل گل

نے مجھے جسمانی مشق کرتے دیکھا اور مجھے ڈائننگ ہال کا مانیٹر مقرر کیا۔ میرے دوست اور میں اس بات سے بہت خوش ہوئے کیونکہ ہمیں کھانے پینے کی آزادی مل گئی تھی

افسوس کہ مانیٹر بننے کے بعد میری پڑھائی میں دلچسپی کم ہو گئی۔ ہمارے سپرنٹنڈنٹ کو تشویش ہوئی کہ شاید میں اپنے والدین کو یاد کرتا ہوں۔ انہوں نے یہ بھی سنا کہ میں بہت باتیں کرتا ہوں۔ ۱۹۴۴ کے آخر یا ۱۹۴۵ کے اوائل میں، مجھے واپس جیت پور بھیجنے کا فیصلہ ہوا

جیت پور میں میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ بے کار وقت گزارنے لگا ۔ محلے کی ایک عورت ہمارے لیے روٹیاں بناتی ، اور میرے والد بکرے کا گوشت پکاتے ۔ یہ ہمارے دو وقت کے کھانے کے لیے کافی ہو جاتا

ہمارا گھر تین بڑے مکانات اور ایک وسیع صحن پر مشتمل تھا۔ میرے دادا بہت امیر تھے، انہوں نے اپنے ہر بیٹے کے لیے الگ الگ ایک گھر بنایا ۔ ہمارے گھر میں ۱۸ سے ۲۰ کمرے تھے، لیکن اب اس میں صرف میرے والد، بڑے بھائی غلام، بہن حلیمہ، اور میں رہتے تھے۔ میرے بھائی عثمان شادی کے بعد ڈھاکہ جا چکے تھے

ایک دفعہ ایک عمارت کا حصہ میرے سر پر آگرا اور میرے سر پر کئی ٹانکے لگے، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں بچ گیا۔ اس حادثے اور والدہ کی عدم موجودگی، اور جیت پور کی تنہائی نے مجھے ذہنی دباؤ کا شکار کر دیا۔ میرے والد کی طرف سے حوصلہ افزائی کے باوجود، میں شدید ڈپریشن کا شکار ہو گیا

میری بہن حلیمہ، جو ٹی بی کی بیماری سے لڑ رہی تھیں، وہ بھی بہت بیمار تھیں۔ ہم نے کئی بار ان کی دیکھ بھال کی کیونکہ وہ اپنی بیماری کی وجہ سے خود کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ محض سولہ سال کی عمر میں انتقال کر گئیں

میرے والد نے میری ڈپریشن سے نجات کے لیے مجھے ایک مزار پر لے جانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے مینا داتار کے مزار پر لے جایا گیا، جہاں ایک ملا نے زنجیروں سے باندھ کر میرا علاج کیا۔ میرے بھائی غلام کو یہ عمل بالکل پسند نہیں آیا اور وہ میرے والد سے الجھنے لگے۔ اس دوران، میرے والد کو دل کا دورہ پڑا اور وہ دنیا سے چل بسے

کچھ مہینوں بعد، میری حالت بہتر ہونے لگی اور میں ممبئی چلا گیا، جہاں میں نے ۱۰۰ روپے ماہانہ پر ایک سیکیورٹی گارڈ کی نوکری حاصل کی۔ میرا کام اناج کے تھیلوں کی نگرانی کرنا تھا۔ ایک دن میں کام کے دوران سو گیا جس کی وجہ سے میرے باس نے مجھے نوکری سے نکال دیا

بعد میں، میں اپنی بہن کے پاس رنگون چلا گیا۔ وہاں میں دوبارہ ذہنی مسائل کا شکار ہوا۔ ایک دن میری آنکھ ایک ہسپتال میں کھلی، جہاں ایک برطانوی ڈاکٹر، ڈاکٹر چیری، میرا علاج کر رہے تھے۔ وہ مجھے روزانہ بجلی کے جھٹکے دیتے، جو بے حد تکلیف دہ تھے، مگر اس علاج کے بعد میں بہتر ہو گیا۔

میرے بہنوئی نے میرا بہت خیال رکھا، وہ مجھے اپنے ساتھ رنگون سے باہر اپنی ملازمت پر لے جایا کرتے تھے۔ ان کی ملکیت میں کئی تیل کے کنوئیں تھے، انکا تعلق ایک امیر خاندان سے تھا۔ بعد میں،

مجھے ان کی کچھ جائیدادوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری دے دی گئی۔ مجھے وہاں ایک برمی لڑکی سے محبت ہوگئ، لیکن اس کے والدین کو یہ رشتہ پسند نہیں آیا، اور مجھے وہاں سے چلے جانے کا کہا گیا

میں ممبئ واپس آیا اور پھر کراچی جانے کا پرمٹ حاصل کیا، جہاں میں اپنے بھائی عثمان کے ساتھ رہنے لگا۔ یہاں زندگی کافی مشکل تھی، لیکن میرا عزم تھا کہ میں بروکریج میں اپنا مقام ضرور حاصل کروں گا۔ کراچی سے میں اپنے ہم عمر کزن علی چنگا موٹن کے پاس سکھر چلا گیا۔ ان کے ساتھ ۱۳ ۔سے ۱۴ مہینے کام کرنے کے بعد پھر کراچی واپس آگیا

میرے بھائی عثمان اور ان کا خاندان ڈھاکہ منتقل ہو گئے، جہاں انہوں نے آدم جی جوٹ ملز میں ملازمت اختیار کر لی۔ میں اپنے کزن باقی موٹن سے ملنے جایا کرتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد اکثر وہیں رات گزار لیتا۔ میری بھابھی مجھے روزانہ گروسری کی خریداری کے لیے ۱۰ روپے دیتی تھیں، جو پیسے بچتے وہ میں اپنے اخراجات کے لیے رکھ لیتا۔ ایک دن میرے کزن نے کہا، "یہ تو ٹھیک ہے کہ تم اپنے کچھ نہ کچھ اخراجات نکال لیتے ہو، لیکن کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ گروسری خریدنا ایک پیشہ ہے؟ تمہیں کوئی ڈھنگ کی نوکری یا کام کاج کرنا چاہیے۔" اس نصیحت کے بعد میں نے ایک کپڑے کی دکان پر ۴۵ روپے ماہانہ پر ملازمت کر لی

ایک دن رمضان کا مہینہ چل رہا تھا۔ میں دوپہر کو گھر جانے کے لیے نکلا اور عصر کی نماز کے بعد تک واپس نہیں آیا۔ باس نے غصے سے کہا کہ میرا یہ رویہ ناقابلِ قبول ہے۔ میں نے ان کی بات کو اہمیت نہ دی اور سات دن کی مزدوری لے کر نوکری چھوڑ دی۔ مجھے بروکریج کے کام میں دلچسپی تھی

کیونکہ اس میں پابندیاں کم تھیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں آزاد رہ سکتا تھا۔ میرے کزن باقی نے مجھے اپنے ساتھی غلام ستار باوانی کے ساتھ کام کرنے کا کہا۔ میرا کام سامان کی ترسیل، معاہدوں اور ڈپازٹس کا انتظام کرنا تھا۔ ہر اتوار کو دلالی لانا بھی میری ذمہ داری تھی

کزن باقی اور ان کے ساتھی کی دلالی اکثر ۱۲۰۰ روپے یا اس سے بھی زیادہ ہوتی تھی، اور مجھے ۱۰ روپے ملتے تھے۔ اس انتظام سے خوش نہ ہو کر میں نے اپنے لیے بروکریج میں مواقع تلاش کرنا شروع کر دیے۔ میرے ایک دوست عثمان دادا (اوسو) کو بھی اس کاروبار میں دلچسپی تھی، تو ہم نے مل کر کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اوسو کے بڑے بھائی حاجی قاسم نے سیٹھ ماما ولی سے کہا کہ وہ ہمیں کام کا موقع دیں تاکہ ہم اپنی گزر بسر کر سکیں۔ سیٹھ ماما ولی نے ہمیں پہلا بریک دیا اور ہم نے اپنے پہلے لین دین سے اچھی خاصی دلالی حاصل کی

سیٹھ ماما ولی نے ہمیں مشورہ دیا کہ کسی بھی وقت یعقوب ٹریڈنگ کمپنی کے اسماعیل سیٹھ سے مدد لیں۔ ہمیں جلد ہی ان کے لیے کئی سودے کرنے کا موقع ملا اور ہر بار ہمیں اچھی ادائیگی ہوئی۔ اسی طرح بروکریج کے کاروبار میں ہمارا آغاز ہوا

ایک دن، ہمیں ۵۰۰۰ گز کا ڈائمنڈ بروکیڈ ۱۱ آنا فی گز میں فروخت کرنے کو ملا۔ شام تک ہمیں ایک خریدار مل گیا جو ساڑھے دس آنا فی گز دینے کو تیار تھا۔ جب ہم نے یہ پیشکش اسماعیل سیٹھ کو دی تو انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن ایک اور بروکر نے اعتراض کیا اور کہا کہ وہ پونے گیارہ آنا فی گز میں خریدنا چاہتا ہے، تاہم اسماعیل سیٹھ نے ہمارے ساتھ سودا کر لیا۔ ہم ان کے شکر گزار تھے کہ

انہوں نے ہمیں موقع دیا۔ اس سودے سے ہمیں ۲۸۰۰ روپے کی ادائیگی ہوئی، جس میں میرا حصہ ۱۴۰۰ روپے تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنا پیسہ کما چکا ہوں

میں اپنی ممانی (مامی مومن) کے پاس گیا، جو احمد حاجی ابداللہ باوانی کی اہلیہ تھیں۔ میں نے انہیں ۱۴۰۰ روپے دیے تو وہ بہت خوش ہوئیں اور وعدہ کیا کہ اگر میں اور پیسے لایا تو وہ میری شادی کروا دیں گی۔ میں نے اگلے تین ماہ کی کمائی ان کے حوالے کر دی۔ انہوں نے حبیب ٹبا کی بیٹی کے لیے میرا رشتہ بھیجا، لیکن وہ تجویز رد کر دی گئی کیونکہ انہیں میرے ماضی کے بارے میں علم ہو گیا تھا

بعد میں، غنی کھٹارا نے میری مامی سے کہا کہ تار محمد حاجی احمد میانور کی بیٹی کے لیے پرپوزل بھیج دیں۔ لیکن مجھے پتہ چلا کہ تار محمد کی بیٹی مومن پہلے مجید، غنی کھٹارا کے بیٹے، سے منسوب تھیں، اور منگنی ٹوٹ چکی تھی۔ میری تجویز کو بالآخر منظور کر لیا گیا۔ نور بائی چنگی، جو علی چنگا موٹن کی والدہ تھیں، نے بھی میری حمایت کی

ایک دن، تار محمد بھائی نے بازار میں میرا انٹرویو کیا اور پوچھا کہ میں کتنی کمائی کرتا ہوں۔ میں نے ایمانداری سے بتایا کہ میں ماہانہ ۲۰۰ سے ۳۰۰ روپے کما لیتا ہوں، جبکہ پچھلے مہینے میں نے ۲۸۰۰ روپے کمائے تھے۔ ان کی نظر میں میری سچائی کی قدر ہوئی، اور انہوں نے مجھے پسند کیا

ایک دن جب میں دوبارہ اپنی مامی کے گھر گیا، تو وہاں دو اور خواتین موجود تھیں: محمد سلیمان سیٹا کی بیوی، رابعہ بائی، اور مجید سلیمان کی بیوی، کھتو بائی۔ مامی نے مجھے بتایا کہ مومن بائی کے والدین نے

رشتہ قبول کر لیا ہے اور مجھے مبارکباد دی۔ میں یہ خبر سن کر حیرت زدہ تھا اور یقین کرنا مشکل تھا کہ میری زندگی میں تبدیلی آنے والی ہے

مارچ ۱۹۵۳ میں میری شادی ہوئی اور میں مامی کے ساتھ رہنے لگا۔ چھ ماہ بعد، مامی نے مجھے بلایا اور کہا کہ یہ گھر ان کا نہیں، اگر وہ انتقال کر گئیں تو مجھے گھر چھوڑنا پڑے گا۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنے لیے کوئی جگہ کا بندوبست کر لوں۔ میں نے ایک بروکر کی مدد سے رنچھور لائن میں اپارٹمنٹ تلاش کرنا شروع کر دیا اور ۲۵۰۰ روپے میں ایک جگہ حاصل کر لی۔ میں اور میری بیوی نے اس نئے گھر کے لیے کچن کا سامان وغیرہ خرید لیا اور اس گھر میں شفٹ ہو گئے

یہ میرا پہلا گھر تھا جہاں سے میں نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ جنوری ۱۹۵۴ میں میرا بیٹا انور پیدا ہوا۔ ۱۹۵۸ میں میرے چوتھے بیٹے، صمد کی پیدائش ہوئی۔ اسی دوران مجھے معلوم ہوا کہ میرا بھائی غلام احمد ابھی تک ہندوستان کے شہر راجکوٹ میں ہی مقیم ہے اور راجکوٹ کے ریلوے اسٹیشن پر رہتا ہے، اور میرا ایک جاننے والا، امین گوڈیل اس کا خیال رکھتا ہے۔ میرا بھائی بولنے سے معذور تھا، لوگ اسے کچھ پیسے وغیرہ دے دیتے تھے تاکہ وہ زندگی گزار سکے۔ میں نے ہر ماہ ۱۰۰ روپے زکریا کامدار کے ذریعے امین گوڈیل کو بھیجنے شروع کیے۔ ایک دن، امین بھائی نے مجھے لکھا کہ پیسوں کی بجائے، میرے بھائی کو ایک گھر کی ضرورت ہے، اس لیے میں نے ۱۹۶۲ میں بھارت جانے کا فیصلہ کیا، جس دوران مجھے ویزا ملا اسی دوران میری بیوی نے ہماری چھٹے نمبر پر بیٹی کو جنم دیا، جس

کا نام ہم نے شیر بانو رکھا۔ وہ بہت بیمار اور کمزور تھی، بچنے کی امید کم تھی۔ میں نے اپنی بیوی اور اس کے بھائی سے کہا کہ اگر میری غیر موجودگی میں کچھ ہو جائے تو اس کے جنازے کا انتظام کر لیں

اس کے بعد میں ٹرین کے ذریعے بھارت روانہ ہو گیا۔ اگلی صبح راجکوٹ پہنچا۔ تانگے والے نے مجھے امین گوڈیل کے گھر پہنچایا۔ امین بھائی اور ان کے دوسرے بھائی وہاں موجود تھے، انہوں نے میرا پرتپاک استقبال کیا۔ ناشتے کے بعد، ہم دفتر گئے، جہاں مجھے معلوم ہوا کہ میرا بھائی ہر روز صبح اپنے گھر پانی پینے آتا ہے، لیکن اس دن وہ نہیں آیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد، جب ہم دفتر واپس جا رہے تھے، تو میں نے اپنے بھائی کو دیکھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی؛ اس نے پھٹے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے اور پاؤں میں جوتے بھی نہیں تھے۔ جیسے ہی اس نے مجھے دیکھا، وہ مسکرایا اور گلے لگا لیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے

امین بھائی نے مجھے متنبہ کیا کہ اپنے بھائی کے ساتھ نہ جاؤں کیونکہ مقامی لوگ جو پیسے وہاں کے لوگ میرے بھائی کو بھیک میں دیتے تھے وہ چور رات کو لوٹ لیتے تھے۔ بعد میں، ہم ایک چائے والے کے ہوٹل میں گئے، جہاں ویٹر نے میرے بھائی کو دور رہنے کے لیے کہا، لیکن جب میں نے بتایا کہ وہ میرا بڑا بھائی ہے، تو اس نے معذرت کی۔ ہم دفتر واپس آ گئے، جہاں میرے بھائی نے مجھ سے اشاروں کی زبان میں ہمارے بھائی عثمان اور بہن رابعہ کے بارے میں پوچھا۔ امین بھائی اس بات پر حیران تھے کہ میں اس کی اشاروں کی زبان کو کیسے سمجھ رہا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ

چاہیں تو میرے بھائی کا امتحان لے سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کیونڈر برانڈ کے سگریٹ منگوائے، اور میرا بھائی درست سگریٹ اور بقایا رقم لے کر واپس آگیا

یہ تجربہ میرے لیے ایک سبق تھا کہ کسی کو معذوری کی وجہ سے کمزور نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ مناسب علاج سے ہر کوئی اپنی زندگی نارمل انداز میں گزار سکتا ہے

اگلے دن امین گوڈیل اور میں صبح دفتر کی طرف جا رہے تھے کہ ہم نے راستے میں ایک بڑی عمر کی ہندو خاتون کو گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے کسی کا انتظار کرتے ہوئے دیکھا، اس کے ہاتھ میں کچھ کھانا تھا۔ امین گوڈیل نے مجھے بتایا کہ یہ عورت گرمی سردی میں کھڑی روز تمہارے بھائی کا انتظار کرتی ہے تاکہ اسے کھانا دے سکے۔ میں اسکے پاس گیا اور پوچھا وہ دھوپ میں کیوں کھڑی ہے، اس نے نرمی سے جواب دیا کہ وہ بہرے کے آنے کا انتظار کر رہی ہے تاکہ اسے کھانا دے سکے - اس واقعے نے میرے ایمان کو اور مضبوط کیا کہ اللہ ہر کسی کو رزق دیتا ہے، اور ہمیں اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے

جمعہ کی نماز کے بعد امین گوڈیل نے میرا تعارف ایک وکیل سے کرایا جس کا نام قاسم بھائی تھا

جب میں اس سے بات کرنے لگا تو اس نے مجھے بورڈنگ اسکول سے پہچان لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے بھائی غلام احمد جان کو اپنے ساتھ پاکستان لے جانے آیا ہوں۔ جب اس نے میرے بھائی کو دیکھا تو کہا کہ میں اسے جانتا ہوں، لیکن یہ تو ہندو ہے تمہارا بھائی کیسے ہو گیا، مجھے اسے قائل کرنا پڑا کہ وہ ہمارا سب سے بڑا بھائی تھا، جو بچپن میں سماعت سے محروم ہو گیا تھا اور حقیقت میں

مسلمان ہے۔ قاسم بھائی کافی مہربان تھے، بات انکی سمجھ میں آگئی اور پاسپورٹ کی درخواست پر ایک مقامی پنڈت کے ضروری دستخط وغیرہ کروا کر کاغذات جمع کروا دیے

اگلے دو دنوں میں بھائی کا پاسپورٹ مل گیا جس میں پاکستان کا ویزہ بھی شامل تھا۔ میں نے امین گوڈیل سے فوراً کہا کہ ہم پاکستان جانے کے لیے تیار ہیں۔ ہم نے ٹکٹ خریدے اور میسانہ، انڈیا کے لیے ٹرین پکڑی۔ سفر کے دوران، میں نے اپنے بھائی کو اوپر والے بستر پر سلایا، اگرچہ میں بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا، مجھے ڈر تھا کہ کہیں میں سو جائوں تو بھائی ادھر ادھر نہ نکل لے، اس لیے میں نے سامنے والی نشستوں پر بیٹھے ہندو جوڑے سے کہا کہ وہ میرے بھائی پر نظر رکھیں تاکہ میں کچھ دیر سو سکوں۔ اگلے دن ہم میسانہ میں تھے۔ وہاں سے ہم نے حیدرآباد/کراچی کے لیے ٹرین پکڑی۔ ہم ساڑھے چار یا پانچ بجے کے قریب کراچی پہنچے۔ وہاں سے ہم رکشہ کر کے گھر آ گئے۔ گھر آکر اچھا لگا، خاص طور پر جب مجھے پتہ چلا کہ میری بیمار بیٹی شیر بانو بہت بہتر محسوس کر رہی ہے، گھر والوں نے اس کا نام بدل کر یاسمین رکھ دیا تھا

میرے بھائی کو پروسٹیٹ کا مسئلہ تھا، اسے بار بار واش روم جانا پڑتا تھا۔ ہم ایک بہت چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے، اسکے بار بار واش روم جانے کی وجہ سے سب پریشان ہو جاتے تھے، اس لیے ہم نے سوچا کہ اسے کچھ عرصہ کے لیے بولٹن مارکیٹ پر واقع ستار ایدھی کے فلاحی ادارے میں داخل کروا دیتے ہیں، پھر دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے، کچھ مہینوں بعد، میں نے اپنے بھائی کو حیدرآباد کے دماغی اسپتال میں داخل کروا دیا۔ یہ میرے لیے ایک نہایت تکلیف دہ بات تھی اور میں

دن رات دعا کرتا تھا کے مجھے کوئی بڑی جگہ مل جائے تو میں اپنے بھائی کو واپس اپنے ساتھ رکھ سکوں۔ آخرکار ایک دن آرام باغ کے قریب مجھے ایک نیا گھر مل گیا اور میں نے اس کے لیے رقم جمع کروا دی۔ گھر مکمل ہونے میں چند ماہ باقی تھے

میرا بیٹا انور ڈی جے کالج میں انٹر سائنس کا طالب علم تھا۔ جب اس کا امریکہ کا ویزا تیار ہوا، تو اسے ٹکٹ کے لیے ۸۵۰۰ روپے درکار تھے۔ میں نے اسے سردار محمد سے ملنے کے لیے بھیجا، جو ایک کاروباری شخص تھے، اور انہوں نے فوراً ضرورت کی رقم دے دی۔ چنانچہ انور مئی ۱۹۷۲ میں شکاگو روانہ ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد، اس نے اپنی مدد سے ہمیں بھی سہارا دیا، اور ہم نے رنچھور لائن کا گھر بیچ کر ۲۲۰۰۰ روپے میں آدم جی نگر میں ایک نیا گھر خرید لیا

اگست ۱۹۷۳ میں انور کراچی آیا اور مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ ہر ماہ رقم بھیجتا رہے گا۔ الحمدللہ، اس نے کبھی اپنا وعدہ نہیں توڑا، اور آج وہ سعودی عرب میں کنگ فیصل اسپیشلسٹ ہسپتال میں کنسلٹنٹ کے طور پر کام کر رہا ہے

کچھ عرصہ بعد ۱۹۸۲ میں، میں نے پہلی منزل پر ایک اور فلیٹ خریدا اور اپنے بھائی کو حیدرآباد سے واپس لے آیا۔ میرے بھائی نے زکریا بھائی کی دکان کے پاس بیٹھنا شروع کر دیا۔ ایک دن اسے پیٹ میں تکلیف ہوئی۔ مجھے پتہ چلا کہ کچھ لوگ اسے غلط خوراک دے رہے تھے، میں نے زکریا بھائی سے بات کی تو انہوں نے بتایا کے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بہرے کو کھانا کھلانے سے قسمت بدل جاتی ہے، جسکی وجہ سے ایک شخص میرے بھائی کو بھنے ہوئے چنے دے رہا تھا جبکہ صدیق لاکھانی کی

بیوی زبیدہ روزآنہ کھانا دے رہی تھی۔ اس کی وجہ سے میرے بھائی کا ہاضمہ خراب رہنے لگا تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ایسا نہ کریں

میرا بھائی کا وزن کچھ زیادہ تھا، اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اسے روزآنہ فجر کی نماز کے بعد سیر کروانی چاہیے۔ میں نے اسے روزانہ سیر کروانا شروع کر دی، ایک دن شاید میں آگے آگے چل رہا تھا پیچھے سے وہ کسی اور طرف نکل گیا، میں نے ڈھوننے کی کوشش کی لیکن کہیں نظر نہیں آیا، آخر کار کافی ڈھونڈنے پر پتہ چلا کہ وہ ایدھی سینٹر پہنچ چکا ہے، اسکی جیب میں ایدھی سینٹر کا کارڈ تھا، شاید کسی پولیس والے نے اسے ایدھی سینٹر پہنچا دیا ہو گا

انٹرویو یہاں تک ہی تھا، نیچے ہاشم باوانی صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

میرا نام یحییٰ ہاشم باوانی ہے اور میں نے اپنے دوست محمد عبدالکریم موٹن کا انٹرویو کیا، جو ایک خود دار و خودپرداختہ شخص تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت سی مشکلات، اتار چڑھاؤ دیکھے، پھر بھی اس کی سوچ کا محور یہی تھا کہ انسان کو زندگی میں مسائل کے بارے میں فکر نہیں کرنا چاہیے بلکہ سخت محنت کرتے رہنا چاہیے اور اپنی زندگی میں خوش رہنا چاہیے۔ میں نے اسکے ساتھ کافی وقت گزار، ہم کئی کئی گھنٹے باتیں کرتے، میں نے ہمیشہ اس کے چہرے پر ایک خوبصورت مسکراہٹ دیکھی۔ اس نے زندگی سے کبھی ہار نہیں مانی اور ہمیشہ یہی کہتا کہ اللہ نے ہمیں اس زندگی میں جو کچھ دیا ہے اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیئے - اسے اشعار سنانے کا بھی بہت شوق تھا۔ ایک شعر اکثر اسکی زبان پر آتا تھا

کبیرا تیری کٹیا گل گتیوں کے ساتھ

جو ہونا تھا سو ہو گا تو کاہے کو اداس

اسکا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم بری صحبت پر مجبور ہو تو بے چین اور افسردہ نہ ہو، بس ان لوگوں کے برے کاموں میں ساتھ نہ دو اور اپنے کام کو ذہن میں رکھو

کون سہہ سکتا ہے حیات جاویداں کی تلخیاں زندگی پر موت کا کتنا بڑا احسان ہے

میرا دوست محمد اپنے بچوں، اپنی بیوی مومن بائی کے ساتھ ساتھ اپنے بھائیوں غلام اور عثمان سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت محنت کی تاکہ خاندان میں حسنِ و سلوک قائم رہ سکے، اس کی زندگی کو دیکھ کر مجھے شاعر اقبال کا ایک شعر یاد آتا ہے

نگہ بُلند سخن دل نواز جان پرسوز

یہی ہے رخت سفر میر کاروان کے لیے

وہ بہت ایماندار آدمی تھا اور اس نے کبھی کسی کو دھوکہ دینے یا رشوت دینے کی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ، وہ کسی بھی معیار کے لحاظ سے غریب تھا لیکن صدقہ خیرات کی ادائیگی سے کبھی باز نہیں آیا۔ وہ کبھی بھی کسی کو نہیں بھولتا تھا جس نے اس کے ساتھ اچھا کیا اسکی ہمیشہ کوشش ہوتی کہ وہ جتنا ہو سکے واپس لوٹائے

میری درخواست ہے کہ جس نے بھی میرے دوست محمد عبدالکریم موٹن کا میرا انٹرویو پڑھا یا سنا ہے، ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں اور اللہ سے دعا کریں کہ وہ انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین وما علینا البلاغ

باب ۱۰

زندگی سے حاصل اسباق

ہم سب ۱۴ فروری ۱۹۶۴ کو ہونے والی عید سے ایک دن پہلے اپنے کپڑے اور جوتے وغیرہ تیار کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ہمیں پتہ ہی نہیں تھا کہ ۱۴ فروری امریکہ میں ویلنٹائن ڈے ہوتا ہے۔ عید کی نماز پڑھ کر ہم واپس گھر آئے اور ایک بہترین ناشتے کے بعد ہم چاروں بھائی اپنے والد کے ساتھ باہر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

والد صاحب نے ہمیں بتایا کہ ہم نانی اماں کے گھر جا رہے ہیں نانی اماں کا گھر ہمارے لیے ہمیشہ خوشی کا باعث ہوتا تھا وہ ہمیں ہر عید پر ایک روپیہ عیدی دیتیں لیکن والد صاحب ہمیشہ احتراماً انہیں منع کر دیتے اور کہتے کہ اپ عیدی مت دیں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نانی اماں کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ نانی اماں سے ملنے کے بعد ہماری اگلی منزل پاک مینشن تھی جہاں والد صاحب کی خالہ مومن مامی رہتی تھی مومن مامی ہمیں ہمیشہ دو روپے کے نئے نوٹ دیتی تھیں، یہ ہمارے لیے ایک نہایت ہی خوشی کا موقع ہوتا تھا۔ والد صاحب تھوڑا ہچکچاتے ہوئے ہمیں عیدی لینے کی اجازت دے دیتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مومن مامی کی مالی حالت کچھ بہتر ہے۔ اس کے بعد ہماری اگلی

منزل آیور اور مامی کا گھر تھا جو میرے والد کی خالہ تھیں، وہاں سے ہم اپنے والد کے کزن بھا غفار اور ہاشم شکور موٹن سے ملنے جایا کرتے۔ ابا کا معمول تھا کہ جب ان کے گھر سے باہر نکلتے تو گھر کے سامنے واقع ریڈیو ہوٹل پر ہمیشہ چائے پینے کے لئے رک جاتے۔ یہاں ہمیں جہازی شکل کا ایک کیک ملتا جو ہم نہایت مزے سے کھاتے۔ یہاں والد صاحب کے کچھ دوست وغیرہ بھی بیٹھے ہوتے تھے جن سے ہمارا تعارف کروایا جاتا اور بتایا جاتا ہے کہ یہ آپ کے فلاں چچا ہیں یا یہ فلاں شخص ہیں اور ہم سب ادب سے انہیں سلام کرتے۔ ان لوگوں کی صحبت میں والد صاحب کو بہت سکون ملتا تھا اور ہمیں بھی ان کی باتیں سننے میں بہت مزہ آتا تھا۔

اس دن اچانک والد صاحب نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ ذرا بچوں کا خیال رکھنا اور خود ایک شخص کی طرف دوڑ پڑے جو جناح کیپ پہنے ہوئے تھا۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ یہ شخص بروکر غنی آدم جی تھا اور والد صاحب اس سے کاروباری معاملات پر کچھ بحث و تکرار کر رہے تھے ان دونوں کے درمیان بروکری کی رقم پر کچھ تلخ کلامی ہو رہی تھی۔ والد صاحب ہمیشہ سے ہر کام نہایت ایمانداری سے کرتے اور دوسروں کو بھی ایمانداری کی نصیحت کرتے تھے۔

وہاں سے نکل کر ہم جیت پور میمن ایسوسیشن پہنچ گئے۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں والد صاحب ہمیں ہمیشہ لے جاتے، تاکہ ہم اپنی کمیونٹی کے لوگوں سے مل سکیں وہاں ہم نے جنرل سیکٹری عبداللہ کامدار کی تقریر سنی، تقریر کے بعد تمام بچوں کو لائبریری میں لے جایا گیا جہاں میں نے پہلی بار ایک لائف میگزین دیکھا جس میں جان ایف کینیڈی کی تصویریں تھیں جس کو نومبر ۱۹۶۳ میں قتل کیا جا

چلتا تھا۔ والد صاحب نے بتایا کہ جان ایف کینیڈی کے بعد سابق نائب صدر جانسن اب صدر بن گئے ہیں ۔ میگزین میں، میں نے ۱۹۶۳ میں کی گئی کئی تقریروں کے اقتباسات پڑھے، اس میں جان ایف کینیڈی کا ایک قول تھا جو اس وقت تو میری سمجھ میں نہیں آیا، لیکن آج وہ میری زندگی کا اہم حصہ بن چکا ہے۔ قول تھا کہ "یہ مت پوچھو کہ آپ کا ملک آپ کے لیے کیا کر سکتا ہے بلکہ یہ پوچھو کہ آپ اپنے ملک کے لیے کیا کر سکتے ہیں"۔ کافی مدت کے بعد مجھے اس کا مطلب سمجھ میں آیا کہ بجائے ذاتی فائدے کے دوسروں کی مدد کرنا ہی اصل نیکی ہے۔

زندگی کے اتنے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد میں نے بہت کچھ سیکھا، میں نے سیکھا کہ حلال روزی کمانا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن اگر آپ ایمانداری سے کمائیں تو اللہ آپ کی محنت کا صلہ ضرور دیتا ہے۔ میرے والد ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ وہ اپنے خاندان کی ضروریات پوری کریں جب میں امریکہ گیا میں نے بھی اپنے والدین اور خاندان کی مالی مدد کرنا کبھی نہیں چھوڑی اور یہ سب بغیر میری بیگم کے تعاون کے ممکن نہ تھا۔

ہم ۱۰ بہن بھائی اماں ابا اور ایک چچا، خاندان کے کل ۱۳ افراد تھے جن کی کفالت کرنا میرے والد صاحب کے لیے نہایت مشکل تھا۔ یہ ہماری زندگی کا سب سے مشکل ترین وقت تھا ۔ کئی دفعہ ہمیں محلے کے دکانداروں سے ۲۰، ۱۰ روپے ادھار لینے پڑتے تاکہ کھانے پینے کا کچھ سامان خریدا جا سکے ۔ ۱۹۹۸ میں میرے والد کے انتقال کے بعد میری والدہ کے اخراجات اور بڑھ گئے تھے لیکن اللہ نے ہمیشہ ہماری مدد کی ہم نے مشکل وقت کا سامنا کیا اور سیکھا کہ کوئی بھی مشکل ہمیشہ کے لیے نہیں

ہوتی آج جب میں ریٹائر ہو چکا ہوں اپنی زندگی کے تجربات اپنی ائندہ نسلوں تک پہنچانا چاہتا ہوں تاکہ وہ ہماری غلطیوں سے سبق حاصل کر سکیں۔

زندگی کی کچھ اہم اصول ہمیشہ یاد رکھیں: حلال کمائی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہمیشہ اپنے والدین کا خیال رکھیں اور صدقہ خیرات دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں ۔یہ بات کبھی مت بھولیں کہ دعا صرف مشکل وقت پڑنے پر نہیں کی جاتی بلکہ یہ زندگی کی سمت درست کرنے کا بھی ایک اہم ذریعہ ہے۔ صحیح اور غلط کو پہچانیں اور ہمیشہ اپنی توجہ صحیح چیز پر رکھیں نہ کہ دوسروں پر جن کا آپ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔

دوستوں اور خاندان والوں کے ساتھ کبھی کاروبار نہ کریں، اور اگر کریں تو پوری لکھت پڑھت کے ساتھ۔ تمام حساب کتاب کاغذ پر لکھیں زبانی باتیں نہ کریں۔

ہر خاندان میں ایسے افراد یا رشتہ دار ہوتے ہیں جو اپ کے مقام تعلیم یا معیار زندگی سے خوش نہیں ہوں گے، ایسے لوگوں پر توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر آپ حق حلال کی کما رہے ہیں تو اس سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔

اگر آپ کی شریک حیات آپ کو والدین کی خدمت کرنے سے روکے، تو کبھی بھی اس کی باتوں میں نہ آئیں۔ اپنی ذمہ داری پوری طرح سے نبھائیں۔ والدین اور بہن بھائیوں پہ خرچ کرنا بھی ایک طرح کا صدقہ ہے اور تمام ابراہیمی مذاہب صدقہ خیرات پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔

اپنے آپ کو کسی بات کا قصوروار مت ٹھہرائیں، جب آپ کے بچے ۱۸ سال یا اس سے زیادہ ہو جائیں اور اپنا ہائی سکول مکمل کر لیں تو انہیں اپنی ذمہ داریاں خود اٹھانے دیں۔ اگر ان کی کچھ مدد کر سکتے ہیں تو ضرور کریں۔

جوانی میں سستی نہ دکھائیں، ۱۸ سال سے لے کر کم از کم ۶۲ سال کی عمر تک جتنی محنت کر سکتے ہیں ضرور کریں، یہ وہ وقت ہوتا ہے جب آپ کے بچے بڑے ہو رہے ہوتے ہیں، بچوں کے مستقبل کا لائحہ عمل طے کرنے میں ان کی مدد کریں۔

دوستی ایک کتاب کی طرح ہے جسے بننے میں برسوں لگ جاتے ہیں جبکہ ایک پل میں ٹوٹ جاتی ہے۔ پرانے دوست سونا ہوتے ہیں نئے دوست ہیرے اگر آپ کو ہیرا مل جائے تو سونا مت بھولے۔ یاد رکھیں کہ ہیرا جڑنے کے لیے آپ کو ہمیشہ سونے کی ضرورت پڑتی ہے۔

زندگی ایک عارضی چیز ہے، اچھا اور برا وقت آتا جاتا رہتا ہے۔ اکثر جب ہم امید کھو بیٹھے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہمارے ساتھ برا ہو رہا ہے، ایسے میں اللہ اوپر سے مسکراتا ہے اور کہتا ہے گھبرا مت میرے بندے یہ صرف ایک موڑ ہے اختتام نہیں۔ اس بات پر یقین رکھیں کہ جو کچھ بھی آپ کے ساتھ ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہی ہوتا ہے ,اچھا یا برا۔ اللہ کبھی بھی کسی پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ کہتے ہیں کہ ایک نابینا شخص نے اللہ سے سوال کیا کہ کیا بینائی سے محروم ہونے سے بدتر بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے، اللہ نے جواب دیا ہاں، بینائی کھونے سے بدتر بصیرت سے محروم ہونا ہے۔ جب آپ دوسروں کے لیے دعا کرتے ہیں تو اللہ آپ کی سنتا ہے، انہیں بھی برکت

دیتا ہے اور آپ کو بھی، اور آپ کو بھی خوشی ہوتی ہے کہ آپ نے کسی کے لیے دعا کی۔ کل کی فکر ،پریشانیاں دور نہیں کرتی بلکہ آپکا آج برباد کر دیتی ہے۔

آخر میں میری زندگی کا ایک اور اہم سبق یہ ہے کہ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے بچوں کو انکی زندگی خود جینے کی اجازت دیں۔ میں اور میری اہلیہ ضرورت کے وقت مشورہ ضرور دیتے تھے لیکن فیصلہ انہیں پر چھوڑتے تھے۔ ہمارے بچوں نے اپنی زندگی کے تمام اہم فیصلے خود سے کیے اور اپنی ذمہ داریوں کو بھی خوب نبھایا جس کے نتیجے میں انہیں ایک اچھی اور خوشگوار زندگی گزارنے کا موقعہ ملا۔ زندگی میں خوشی پیسہ کمانے سے زیادہ اہم ہے۔ ہمیں اپنی اگلی نسلوں کو پیسہ کمانے کے بجائے خوش رہنا سکھانا چاہیے، گو پیسہ بھی اہم ہے لیکن ایسے پیسے کا کیا فائدہ کے انسان جس سے راحت و سکون ہی حاصل نہ کر سکے۔ اپنے بچوں کی تربیت ایسی کریں کہ وہ اپنے فیصلے خود سے کر سکیں۔

یہ جو کچھ آپ نے پڑھا میری انگریزی کتاب ٹریول ٹو دی فائنل ڈیسٹینی کا مکمل ترجمہ تو نہیں لیکن اس میں تمام اہم واقعات شامل ہیں۔ اگر آپ مزید تفصیل جاننا چاہیں تو میری انگریزی کی کتاب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

آپکی دعاؤں کا طلبگا، انور موٹن۔